الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

ہر مسافر جانتا ہے کہ ایک ٹرین چھوٹ جائے تو جلد ہی بعد دوسری ٹرین مل جاتی ہے جس سے وہ اپنا سفر جاری رکھ سکے

یہ پلیٹ فارم کا سبق ہے۔ مگر اکثر لوگ اس معلوم سبق کو اس وقت بھول جاتے ہیں جب کہ زندگی کی دوڑ میں ایک موقع ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہو۔

شمارہ ۲۰ — زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے — قیمت فی پرچہ
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
جولائی ۱۹۷۸ — بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی — دو روپے

الرسالہ

شمارہ ۲۰ جولائی ۱۹۷۸

جمعیۃ بلڈنگ ● قاسم جان اسٹریٹ ● دہلی ۶

قال الاوزاعی بلغنی ان اللہ اذا اراد بقوم شرا الزمھم الجدل ومنعھم العمل

ابن عبد البر، جامع بیان العلم وفضلہ
جزء ثانی، صفحہ ۹۳
ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر

اللہ جب کسی قوم کے لئے شر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو جدال میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس کو عمل سے روک دیتا ہے۔

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ کوئی صحافتی کاروبار نہیں۔ وہ صرف اس بات کی چیتاونی ہے کہ لوگو، ہوشیار ہو جاؤ۔ کیونکہ وہ وقت بہت تیزی سے دوڑا چلا آرہا ہے جبکہ سارے لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے کر دیئے جائیں گے۔ کسی کے لئے نہ کج بحثی کا موقع ہوگا اور نہ ہٹ دھرمی کا۔ ہر آدمی مجبور ہوگا کہ وہ سچائی کے آگے اپنی گردن جھکا دے۔ قبل اس کے کہ یہ وقت آئے، بہترین عقلمندی یہ ہے کہ ہم آج ہی سچائی کے آگے جھک جائیں، کیوں کہ کل کا جھکنا رسوائی ہے اور آج کا جھکنا عزت۔

ایسی حالت میں ہم سے زیادہ نادان اور کوئی نہ ہوگا اگر ہم اپنے خلاف تنقیدوں پر غور نہ کریں۔ مگر یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ ان تنقیدوں میں یا تو لفظی شور و غل ہے یا غیر متعلق بحثیں۔ کاش لوگوں کو معلوم ہوتا کہ دو میں سے کوئی ایک ہی رویہ ان کے لئے صحیح ہے: علمی رد یا علمی اعتراف۔ بے معنی بحثیں کسی کو دنیا میں بچانے والی بن سکتی ہیں مگر آخرت میں وہ کسی کو بچانے والی ثابت نہ ہوسکیں گی۔ خواہ اپنے طور پر وہ کتنی ہی خوش فہمی میں مبتلا رہے

زندگی کی سب سے زیادہ سنگین حقیقت یہ ہے کہ ہماری ہر بات خواہ وہ بظاہر ایک انسان کے سامنے ہو، حقیقۃً وہ خدا کے سامنے ہوتی ہے۔ کیونکہ آخری طور پر ہر آدمی کو خدا ہی کے سامنے جواب دہ ہونا ہے — کوئی بات اپنے منھ سے نکالنے سے پہلے اس کو انصاف کے ترازو پر تول لیجئے۔ اگر آج آپ نے ایسا نہ کیا تو کل کے دن خدا اس کو انصاف کے ترازو پر تولے گا اور جس کو خدا کے یہاں تولا گیا اس کے لئے ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں (من نوقش فقد ھلک)

یہ سنتِ یوسفی نہیں

قرآن میں سابق اہل کتاب کی جن عادتوں کا ذکر ہے، ان میں سے ایک یہ ہے:

"ان کا ایک گروہ (علمائے قائدین) کتاب میں زبان کو موڑتا ہے تاکہ تم ان کی کہی ہوئی بات کو خدا کی بات جانو۔ حالاں کہ وہ خدا کی کتاب سے نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ حالاں کہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں۔ وہ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں۔ حالاں کہ وہ خوب جانتے ہیں (آل عمران ۷۸)

زبان کو مروڑ کر بات کرنا (لیّ لسان) سے کچھ لوگ یہ مراد لیتے ہیں کہ زبان کی گردش سے الفاظ کو بدل دیا جائے۔ جزدی طور پر یہ مفہوم بھی اس میں شامل ہے۔ مگر اس کا اصل مفہوم تحریف معنوی ہے۔ (لوی لسانہ بکذا کنایۃ عن الکذب وتخرص الحدیث، راغب) مثلاً اپنے کسی غلط عمل کے ساتھ کتاب اللہ میں لفظی اشتراک ڈھونڈ کر یہ کہنا کہ یہ عمل فلاں حکم الٰہی کے مطابق ہے یا اس سے لیا گیا ہے۔ شیخ محمد عبدہ مصری نے کہا ہے کہ یہ بھی لیّ لسان کی ایک مثال ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنے مخاطبین کو سمجھانے کے لئے مجازی طور پر خدا اور بندے کے لئے اب اور ابن (باپ اور بیٹے) کے الفاظ استعمال کئے۔ بعد کو مسیحی علماء نے اس کو حقیقی طور پر لے لیا اور اس لفظی مشابہت سے فائدہ اٹھا کر گمراہی کی پوری عمارت کھڑی کر دی۔ توحید کی دعوت سے شرک کا عقیدہ نکال لیا۔

کتاب میں زبان کو موڑنے کا مطلب کتاب کے الفاظ کو موڑنا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ لیّ لسان سے مراد تقریباً وہی

چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں غلط تعبیر (Misinterpretation) کہا جاتا ہے۔ یہ فعل اگر جان بوجھ کر ہو تو اللہ کے نزدیک وہ بدترین جرم ہے۔ تاہم جس طرح ہر فعل کے درجات ہیں، اسی طرح اس فعل کے بھی بہت سے درجے ہیں

کچھ باحوصلہ مسلمان "محمدی سیاست"، کا نعرہ لے کر اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں سے لڑ جاتے ہیں اور ان کو اقتدار سے بے دخل (Unseat) کرنے کی تحریک چلاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں دونوں کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے۔ حکمران طبقہ اپنے سیاسی حریفوں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیتا ہے۔ اس کے بعد محمدی تحریک کے قائدین اپنی سالانہ "روداد جہاد"، شائع کرتے ہیں جس میں فخر کے ساتھ یہ الفاظ درج ہوتے ہیں:

"ہماری تحریک کے مرکزی، صوبائی اور ضلع کی سطح کے عہدہ داروں میں سے شاید ہی کوئی شخص سنت یوسفی ادا کرنے سے محروم رہا ہو"

اس قسم کی قید کو "سنت یوسفی"، کا نام دینا بھی لی لسان کی ایک قسم ہے۔ حضرت یوسفؑ بلاشبہ جیل میں ڈالے گئے جس طرح محمدی سیاست کے مجاہدین جیل میں ڈالے گئے۔ مگر دونوں میں لفظی اشتراک کے سوا اور کوئی نسبت نہیں۔ حضرت یوسف عؑ کے جیل جانے کی وجہ یہ نہ تھی کہ انھوں نے اپنے وقت کے حکمراں کے خلاف اپوزیشن پارٹی بنائی تھی اور اس کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی پرشور تحریک چلا رہے تھے اور حکمرانؑ نے اپنے سیاسی حریف کو میدان سے ہٹانے کے لئے آپ کو جیل میں ڈال دیا۔ اسی کی وجہ مکمل طور پر غیر سیاسی تھی۔ حضرت یوسف یک طرفہ کارروائی کے تحت جیل بھیجے گئے تھے نہ کہ سیاسی حریف بننے کے جرم میں۔ حکمرانوں سے سیاسی منازعت چھیڑنا اور نتیجۃً مسلمانوں کا دو دھڑوں میں بٹ جانا تو اسلام میں صریح طور پر ممنوع ہے۔ اس قسم کی غیر اسلامی سیاست کے نتیجہ میں جیل جانا اور اس کو سنت یوسفی کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالے جو شریعت میں حرام ہے اور اس کے بعد اس کی نماز جنازہ ادا کر کے اپنے اخبار کے صفحہ اول میں یہ اعلان کرے:

"مقتول کی نماز جنازہ شرعی طریقہ پر ادا کی گئی"

یہی وہ چیز ہے جس کی بابت قرآن میں کہا گیا:
کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور اس کے دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو (بقرہ ۸۵)

مسلمانوں میں سیاسی دھڑے بندی پیدا کرنا جو پیغمبرانہ شریعت کے خلاف ہے اور جب طاقت ور فریق اپنے مخالف فریق کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دے تو اس کو اپنے لئے پیغمبرانہ سنت قرار دینا —— یہ طریقہ خدا کے غضب کو بھڑکانے والا ہے نہ یہ کہ اس کے نتیجہ میں خدا کی رحمت ہمارے اوپر سایہ کرے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پختگی اس صلاحیت کا نام ہے کہ آدمی ان چیزوں کے ساتھ پرامن طور پر رہ سکے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔

پختگی انکساری کا نام ہے۔ ایک پختہ انسان یہ کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے کہ "میں غلطی پر تھا"۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جب خدا کے عہد کو توڑ دیا جائے

سورہ مائدہ کی آیت ۱۲ میں بتایا گیا ہے کہ امت محمدی سے پہلے جو لوگ دین خداوندی کے حامل بنائے گئے تھے، ان سے اللہ نے کیا عہد لیا تھا اور کیا ذمہ داریاں ان کے اوپر ڈالی تھیں۔ وہ یہ تھا کہ ——— وہ اپنی زندگی میں نظم و اتحاد قائم کریں گے۔ وہ نماز کی ادائگی کریں گے۔ اپنے مالوں میں زکوٰۃ دیں گے۔ دعوت حق کے ساتھ تعاون کریں گے اور اپنی جان و مال کو اس سے بچا کر نہ رکھیں گے۔

آیت نمبر ۱۳ میں بتایا گیا ہے کہ وہ اس عہد پر قائم نہ رہے۔ انھوں نے اس کو توڑ دیا۔ خدا کے مقرر کئے ہوئے راستہ کو چھوڑ کر وہ خود ساختہ راہوں پر چلنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے ان کو جو سزا ملی وہ ——— لعنت تھی۔ وہ خدا کی رحمت سے دور کر دیئے گئے۔

لعنت کی تشریح کرتے ہوئے مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں:

ابعدناهم عن الحق وطردناهم عن الهدىٰ

یعنی خدا نے ان کو ہدایت کے راستے سے ہٹا دیا اور حق سے دور کر دیا۔ اس "لعنت" کے بہت سے درجے ہیں۔ جب بھی خدا پرستی کا کوئی دعوے دار گروہ اپنے دعوے کے تقاضے پورے کرنا چھوڑ دیتا ہے تو اس کے اوپر اس عمل کی ابتدا ہو جاتی ہے اور مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ یہ عمل جب تک درمیانی مرحلوں میں ہوتا ہے واپسی کا امکان باقی رہتا ہے۔ مگر جب لوگ اپنے انحراف میں اس انتہائی درجے تک پہنچ جائیں جس درجے تک یہود پہنچ گئے تو خدا کی طرف سے ان کے اوپر لعنت کی تکمیل کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کا حق کی طرف واپس آنا ممکن نہیں رہتا۔

لعنت کا یہ عمل کن شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے، اس کے پانچ خاص مظاہر قرآن میں بتائے گئے ہیں۔

۱۔ دل کا سخت ہو جانا ——— اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص یا گروہ خدا پر ایمان رکھنے کے باوجود اس کے تقاضوں کو مسلسل نظر انداز کرتا رہتا ہے تو اس کا ضمیر کند ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر سے وہ لطیف احساسات ختم ہو جاتے ہیں جو آدمی کو باطل کے خلاف بے چین رکھتے ہیں اور حق کی طرف اسے کھینچتے رہتے ہیں۔ حق پرستی کی قوی ترین دلیلیں اس کو بے وزن معلوم ہوتی ہیں، خدا و رسول کے صریح ارشادات سامنے آنے کے باوجود اس کے اندر یہ جذبہ نہیں ابھرتا کہ وہ اپنی غلط روش کو چھوڑ دے۔

۲۔ کلام الٰہی میں تحریف ——— یعنی ان کے اندر اتنی ڈھٹائی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بدلنے کے بجائے خدا کے کلام کو بدلنا شروع کر دیتے ہیں۔ کلام الٰہی کی حیثیت ان کے نزدیک یہ نہیں رہتی کہ وہ انھیں راستہ بتائے بلکہ اس کا کام یہ ہو جاتا ہے کہ وہ ان کے غلط اعمال کی تصدیق کرے۔ اس مقصد کے لئے وہ اس کی غلط تاویلیں کرتے ہیں، وہ خدا کے قانون کے ساتھ اس قسم کا عمل کرنے لگتے ہیں جو وکالت خانوں میں انسانی قانون کے ساتھ ہوتا ہے، وہ خدا کے کلام کو اس کی صحیح جگہ سے ہٹا دیتے ہیں۔

۳۔ تعلیمات الٰہی کے بڑے حصے کو بھلا دینا ـــ یہاں بھلا دینے سے مراد ترک کر دینا ہے۔ یعنی دین کی بعض شکلیں تو ضرور اب بھی ان کے یہاں موجود رہتی ہیں، مگر اس کے بڑے حصے یا دوسرے لفظوں میں اس کی روح کو وہ چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ کسی صاحبِ کتاب گروہ کی یہ حالت اس وقت ہوتی ہے جب دین مقصدِ زندگی کی حیثیت سے ان کے درمیان باقی نہیں رہتا۔ جب ایمان ایک زندہ شعور کے بجائے ایک روایتی عقیدے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس وقت ان لوگوں کی زندگی کے حقیقی مسائل کچھ اور ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کے ذہن اور ان کے جذبات کسی اور سمت میں کام کرنے لگتے ہیں۔ البتہ دین کا اقرار اور دین کی بعض خارجی شکلیں اب بھی ان کے یہاں موجود رہتی ہیں، مگر وہ محض ایک نسلی اور روایتی چیز کی حیثیت سے ان کے اوپر چپکی ہوئی ہوتی ہیں، اس سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

۴۔ خیانت ـــــ یہ چوتھی چیز ہے جن کو ان لفظوں میں ظاہر فرمایا ہے "اور تم برابر ان کی خیانتوں سے مطلع ہوتے رہتے ہو" خیانت کے معنی ہیں۔ کسی شخص سے جس عمل کی توقع کی جائے اس کے خلاف کام کرنا۔ مثلاً عربی میں کہتے ہیں۔ خَانَہٗ سَیْفُہٗ (اس کی تلوار نے خیانت کی) یعنی آدمی نے اپنے دشمن کے مقابلہ میں تلوار پر جو بھروسہ کیا تھا، اس میں تلوار پوری نہیں اتری۔ اس سے معلوم ہوا کہ لعنت زدہ گروہ سے اس کا کردار رخصت ہونے لگتا ہے، اس کے قول و فعل میں مطابقت باقی نہیں رہتی۔ وہ وعدہ کرتا ہے مگر اسے وفا نہیں کرتا۔ دوسروں سے فائدہ اٹھا کر دوسروں کے جو حقوق وہ اپنے اوپر عائد کرتا ہے ان کو پورا کرنے کی اسے کوئی فکر نہیں ہوتی۔ وہ نہ تو ان حقوق کو تسلیم کرتا جو مالک کی طرف سے بندے کے اوپر عائد ہوتے ہیں اور نہ اس اعتماد میں پورا اترتا جو ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے۔

۵۔ باہمی عداوت اور بغض ـــــ یعنی جب انھوں نے خدا کی رسی چھوڑ دی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص کا قبلہ الگ الگ ہو گیا۔ وہ باہم جڑے رہنے کے بجائے باہم متفرق ہو گئے۔ دینی معاملات میں ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق اور دنیوی معاملات میں ایک دوسرے کی لوٹ کھسوٹ ان کا طریقہ بن گیا۔ ان میں سے ہر شخص کے سامنے صرف ذاتی اغراض ہیں۔ اور جب ذاتی اغراض کسی گروہ کا قبلہ بن جائیں تو اختلافات اور کش مکش کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ ذاتی اغراض کی پرستش کے ساتھ اتحاد باقی نہیں رہ سکتا۔ خدا کی رسی سے بندھا رہنا اتحاد و اتفاق پیدا کرتا ہے اور خدا کی رسی کو چھوڑ دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آپس میں بغض و عناد پھوٹ پڑے۔

اس تفصیل کے بعد بتایا گیا کہ جو لوگ ایسے کسی گروہ کی اصلاح کے لئے اٹھیں، ان کا اخلاق کس قسم کا ہونا چاہئے۔ فرمایا "ان کو معاف کرو اور ان سے درگزر کرو، اللہ یقیناً محسنین کو پسند کرتا ہے"۔ یعنی ایسے گروہ کی نفسیات اس قسم کی ہو جاتی ہیں کہ جب انھیں کچھ خدا کے بندے ان کے بھولے ہوئے سبق کی طرف بلاتے ہیں تو ان کی طرف سے جو جواب ملتا ہے وہ نہایت اشتعال انگیز اور داعی کے لئے سخت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ داعی خود بھی اسی قسم کا جواب نہ دینے لگے جو بگڑے ہوئے گروہ کی طرف سے اس کو مل رہا ہے بلکہ وہ ایسی باتوں کو نظرانداز کر کے اپنا کام جاری رکھے۔

آخر میں فرمایا۔ "بہت جلد اللہ انھیں بتائے گا کہ وہ کیا کر رہے ہیں"۔ یعنی داعی کو اپنے فرض کی ادائیگی کی فکر ہونی چاہیے، نہ کہ مخاطب کے انجام کی۔ یہ کام اللہ کے ذمہ ہے اور وقت آنے پر وہی اس کا فیصلہ کرے گا۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

لا تعتمد علیٰ خلق رجل حتی تجربه عند الغضب
(العبقریات الاسلامیه، ۵۰۵)

کسی آدمی کے حسن اخلاق پر بھروسہ مت کرو جب تک غصہ کے وقت اس کا تجربہ نہ کرلو۔

جواب کے دو طریقے

جب غصہ دلانے والی بات کی جائے تو اس کے جواب کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی بھڑ اٹھے اور ناقد پر لعن طعن کرنے لگے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ناقد کی بات کو بالکل ٹھنڈے ذہن سے سنا جائے۔ اس کی بات کے غیر متعلق پہلوؤں کو نظرانداز کرتے ہوئے اصل بات کا جواب بالکل سادہ طریقے سے دے دیا جائے۔ دونوں طریقوں میں صرف دوسرا طریقہ اسلامی طریقہ ہے۔ اس سلسلے میں یہاں چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ ابن عبدالبر اندلسی (م ۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:

روینا ان طاؤسا و وهب بن منبه التقیا فقال طاؤس لوهب یا ابا عبد الله بلغنی عنك امر عظیم۔ فقال ماهو۔ قال تقول ان الله حمل قوم لوط بعضهم علیٰ بعض۔ قال اعوذ بالله۔ ثم سکتا قال فقلت هل اختصما قال لا۔

جامع بیان العلم وفضلہ، جزء ثانی، صفحہ ۹۵

ہم سے بیان کیا گیا کہ طاؤس اور وہب بن منبہ دونوں ایک دوسرے سے ملے۔ طاؤس نے وہب سے کہا۔ اے ابو عبداللہ، آپ کے بارے میں مجھے ایک بڑی سنگین بات پہنچی ہے۔ انھوں نے پوچھا وہ کیا۔ طاؤس نے کہا، میں نے سنا کہ آپ کہتے ہیں کہ اللہ ہی نے تو قوم لوط کے بعض لوگوں کو بعض لوگوں پر چڑھایا تھا۔ یہ سن کر وہب نے کہا اللہ کی پناہ۔ پھر دونوں چپ ہو گئے۔ میں نے راوی سے پوچھا۔ کیا دونوں میں بحث ہوئی۔ انھوں نے جواب دیا نہیں۔

۲۔ مولانا احمد علی لاہوری کے صاحبزادہ مولانا جلیب اللہ لاہوری نے مولانا سید حسین احمد مدنی (۱۹۵۷ — ۱۸۷۹) کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ دارالعلوم دیوبند میں مولانا مدنی کے دورۂ حدیث میں شریک تھے۔ شرکاء درس میں سے کسی طالب علم کو شرارت سوجھی۔ اس نے مولانا کے پاس ایک رقعہ بھیجا اور اس کے ذریعہ تحریری طور پر یہ سوال کیا کہ آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ حرامی ہیں۔ مولانا مدنی نے رقعہ لے کر رکھ لیا اور پہلی نشست میں کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری نشست میں جب طلبہ جمع ہوئے تو آپ نے فرمایا "کسی دوست نے مجھ کو رقعہ لکھا ہے کہ تو اپنے باپ سے نہیں ہے"۔

یہ سنتے ہی تمام مجلس میں ہیجان برپا ہو گیا۔ طلبہ غیظ و غضب سے بھر گئے کہ کس گستاخ نے یہ حرکت کی ہے۔ مولانا مدنی نے فرمایا "خبردار کسی کو غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا حق ہے کہ میں سوال کرنے والے کی تسلی کروں"، پھر سنجیدگی کے ساتھ فرمایا" میں ضلع فیض آباد قصبہ ٹانڈہ کا رہنے والا ہوں۔ اس وقت بھی میرے والدین کے نکاح کے گواہ زندہ ہیں۔ خط بھیج کر یا وہاں جاکر سمجھ

کیا جائے۔"

ہفت روزہ خدام الدین لاہور۔ مدنی نمبر جنوری ۱۹۵۸ء، صفحہ ۳۸

اب ایک برعکس مثال لیجئے۔

ایک بزرگ کی تقریروں اور اجتماعات میں ایک شخص کثرت سے آتا تھا۔ وہ بزرگ کا بہت معتقد ہوگیا۔ تاہم بعد کو وہ کسی وجہ سے بگڑ گیا اور بزرگ کے خلاف تنقیدیں کرنے لگا۔ اس سلسلے میں بزرگ موصوف لکھتے ہیں: "بات یہ ہے کہ اس شخص کے دل میں مرزا غلام احمد قادیانی کی عقیدت شدت کے ساتھ موجود تھی، میں نے اپنی ایک تقریر میں ڈنکے کی چوٹ کہا کہ جو شخص حضرت مسیح کی ولادت بن باپ کے نہیں مانتا، میرے نزدیک وہ قرآن مجید پر ایمان ہی نہیں رکھتا۔ میری یہ بات اس شخص کے نہاں خانہ قلب کے بت خانہ پر ٹھیک نشانہ پر پڑی۔ اس نے میرے اجتماعات میں آنا بند کردیا اور مرزائیانہ ہتھکنڈوں سے کام لے کر میرے خلاف لوگوں کو بھڑکانے اور اکسانے لگا۔"

اس کے بعد مذکورہ شخص کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ تیری وہ دبی ہوئی قادیانی رگ ہے جس کو چھیڑنے کا میں مرتکب ہوا ہوں، پھر اگر کوئی مردانگی کا شمہ بھی ہے تو سامنے آ اور اصل مسئلہ پر بات کر، یہ آبرو باختہ عورتوں کے مانند "بھائیوں" کا نام لے لے کر اصل میں "یاروں" کے لئے رونے سے کیا حاصل؟ ——

اب جو یہ جملہ قلم سے نکلا تو ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ یہ مردانگی کا "شمہ" بھی اس شخص کے بارے میں کیسے ہوگیا؟ ہمیشہ کا ہڈیوں کی ٹی بی کا مارا ہوا اور چہرے اور سر دونوں کے اعتبار سے بالکل "فارغ البال" اور خارش زدہ انسان جو ساری عمر شادی کے بارے میں سوچ بھی نہ سکا، اب آخری عمر میں کٹنیوں کا سا کردار اور رکھیں میں آگ لگا کر تماشا دیکھنے کا انداز نہ اختیار کرے تو آخر اور کیا کرے؟

ماہنامہ ۔ ۔ ۔ مئی ۱۹۷۸ء، صفحہ ۷۲

وہ انھیں کھلاڑیوں کی بی ٹیم ہوگی

Second Eleven

Mr T. A. Pai, ex-Cabinet Minister, when asked to comment on the "no-change" in the style of functioning and the poor performance of the Government, is said to have remarked: "Why should anyone have expected anything better from them? They are only our B team."

The Illustrated Weekly of India
May 14, 1978

مسٹر ٹی۔ اے۔ پائی اندرا حکومت میں وزیر کابینہ تھے۔ ان سے موجودہ جنتا حکومت کے بارے میں پوچھا گیا کہ سرکاری مشین کی سست رفتاری اور اس کا طریقہ جو پہلے تھا وہی اب بھی کیوں ہے۔ حکمراں پارٹی کی تبدیلی کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مسٹر پائی نے جواب دیا "لوگوں نے موجودہ حکومت سے کسی بہتر چیز کی توقع کیوں کرلی تھی۔ وہ آخر ہماری ہی "بی ٹیم" تو ہیں۔

اس میں ان مسلمانوں کے لئے بھی سبق ہے جو ایک ملکی پارٹی کو ہٹا کر دوسری ملکی پارٹی کو برسر اقتدار لانے میں ملت کے مستقبل کا سیاسی خواب دیکھا کرتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ایک کو ہٹا کر جس دوسرے کو وہ اوپر لائیں گے، وہ بھی پچھلے کھلاڑیوں ہی کی "بی ٹیم" ہوگی۔

کتاب "زلزلۂ قیامت" کا ایک صفحہ

موجودہ زمانہ کے بعض ملحد مفکرین نے دیکھا کہ انسان کسی طرح مذہب کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ انھوں نے مذہب کو ایک ناگزیر نفسیاتی ضرورت کے طور پر مان لیا۔ البتہ انھوں نے کہا کہ مذہب کی بنیاد خدائی الہام پر نہیں ہونی چاہئے۔ اس فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے جولین ہکسلے نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے:

RELIGION WITHOUT REVELATION

(مذہب بغیر الہام) ۔ اس قسم کا مذہب تو ابھی عملاً وجود میں نہیں آیا۔ تاہم "اسلام بغیر آخرت" کے بہت سے نسخے ہمارے یہاں رائج ہو گئے ہیں۔ اس اسلام میں سب کچھ ہے مگر جہنم کا اندیشہ نہیں۔ اصحاب رسول کو جو اسلام ملا تھا، اس نے انھیں اس درجہ بے قرار کر دیا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جہنم کی آگ انھیں کے لئے بھڑکائی گئی ہے۔ اب اسلام کے مجاہدین نے ایسا اسلام دریافت کر لیا ہے جس کے خزانے میں صرف جنت ہی جنت ہے۔ جہنم کا اس میں کہیں گزر نہیں۔

کچھ لوگوں کے لئے ان کی دنیا کی کامیابی ہی اس بات کی یقینی علامت ہے کہ ان کی آخرت بھی ضرور کامیاب ہوگی۔ کچھ لوگوں نے ایسے زندہ یا مردہ بزرگ پا لئے ہیں جن کا دامن تھام لینے کے بعد اب ان کے لئے آخرت کا کوئی خطرہ نہیں۔ کچھ لوگ اتنے خوش قسمت ہیں کہ معمولی معمولی باتوں پر صبح و شام ان کے لئے جنت کے محلات رزرو ہو رہے ہیں، پھر ان کو آخرت سے ڈرنے کی کیا ضرورت۔ کچھ لوگوں کو اسلام نے عالیشان سیاسی منصوبے دیئے ہیں اور وہ قائدانہ اعزازات کے زیر سایہ جنت کا راستہ طے کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اور بھی زیادہ آسان راستہ تلاش کر لیا ہے ——— جگمگاتے ہوئے پنڈالوں میں تقریر کے کرتب دکھاؤ اور سیدھے جنت الفردوس میں پہنچ جاؤ۔

اس قسم کا اسلام خواہ دنیا میں کتنا ہی دلفریب نظر آتا ہو، آخرت میں اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔ آخرت میں کام آنے والا اسلام وہ ہے جو آدمی کی زندگی میں بھونچال بن کر داخل ہوا ہو۔ جو قیامت کے زلزلہ سے پہلے آدمی کے لئے زلزلہ ثابت ہو۔ اس قسم کا اسلام جب کسی کو ملتا ہے تو اس کے لئے ہر معاملہ خدا کا معاملہ بن جاتا ہے۔ "چھوٹے" کو بے عزت کرتے ہوئے اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ رب العالمین کے سفیر کو بے عزت کر رہا ہے۔ "بڑے" کی خوشامد کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ خدا کی غیرت کو چیلنج کر رہا ہے۔ حق واضح ہونے کے بعد اس کو نظر انداز کرنا اس کے نزدیک ایسا ہی بن جاتا ہے جیسے کوئی شخص جنت اور جہنم کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھے، پھر بھی جنت کو چھوڑ کر جہنم میں کود پڑے۔

زلزلۂ قیامت

از

مولانا وحید الدین خاں

ادارۂ الرسالہ کی تازہ پیش کش

جس کو پڑھ کر دل دہل اٹھیں

اور آنکھیں آنسو بہائیں

مکتبہ الرسالہ

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی 110006

آخرت کی دنیا

قطب جنوبی کے سمندروں میں برف کے بہت بڑے بڑے تودے ہوتے ہیں جن کو آئس برگ (Iceberg) کہا جاتا ہے۔ یہ برفانی پہاڑ سطح سمندر پر تیرتے رہتے ہیں۔ ان کے حجم کا دس میں تقریباً نو حصہ پانی کے اندر ڈوبا رہتا ہے اور صرف ایک حصہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ ایسی ہی کچھ مثال ہماری زندگی کی ہے۔ خدا نے انسان کو ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ پھر اس کی عمر کا لگ بھگ سو سال موجودہ دنیا میں رکھ کر بقیہ تمام عمر کو موت کے بعد آنے والی دوسری دنیا میں ڈال دیا۔ ہم ماں کے پیٹ میں پرورش پا کر اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں۔ اور پھر بچپن، جوانی اور بڑھاپا کے مرحلوں سے گزر کر مر جاتے ہیں۔ تاہم موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں۔ موت ہم کو دوبارہ ایک نئے پیٹ، کائنات کے پیٹ میں ڈال دیتی ہے۔ اس کے بعد انسان ایک اور عالم میں آنکھ کھولتا ہے۔ یہ آخرت کا عالم ہے۔ موجودہ دنیا عارضی ہے، آخرت کی دنیا ابدی ہے۔ موجودہ دنیا کی تکلیفیں بھی معمولی ہیں اور لذتیں بھی معمولی ــــ مگر اگلی دنیا میں دونوں چیزیں اپنی آخری انتہا پر ہوں گی۔ وہاں جس کے حصہ میں تکلیف آئے گی، وہ بدترین عذاب میں ہمیشہ کے لئے تڑپتا رہے گا۔ جس کے حصے میں راحتیں آئیں گی، وہ کمال درجہ کی راحتوں میں ابدی طور پر خوشیوں اور لذتوں کا لطف اٹھاتا رہے گا۔

امتحان کی مصلحت کی بنا پر آخرت کی دنیا کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔ مگر ہمارے گرد و پیش

آدمی اگر یہ جان لے کہ موت کے دوسری طرف بھی ایک دنیا ہے جو زیادہ مکمل ہے تو موجودہ زندگی اس کے لئے بے حد بامعنی ہو جائے گی۔ وہ اپنی جدوجہد کی منزل کو پالے گا۔ اس کی زندگی ــــ آخرت رخی زندگی (Akhirat Oriented Life) ہو جائے گی جو بالآخر ایک شاندار کامیابی پر ختم ہو گی۔ اس کے برعکس جو شخص موت کے بعد آنے والی دنیا کو نہ دیکھ رہا ہو اس کی زندگی دنیا رخی زندگی ہو گی۔ اس کی کوششیں اسی دنیا میں بھٹکتی رہیں گی۔ مرنے کے بعد جب وہ اگلی وسیع تر دنیا میں داخل ہو گا تو اچانک اس کو معلوم ہو گا کہ یہاں کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں وَمَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (بقرہ ۲۰۰)
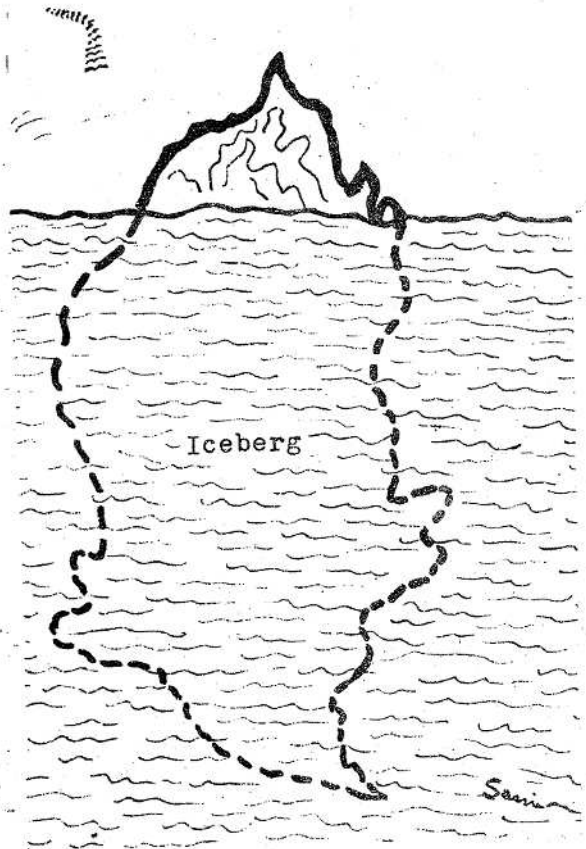
ایسی نشانیاں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم آخرت کی دنیا کو سمجھ سکتے ہیں۔

ایک کمرہ ہے۔ اس میں کچھ آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ دیوار، فرنیچر، آدمی وغیرہ کی صورت میں جو چیزیں کمرہ کے اندر نظر آرہی ہیں، بظاہر وہی کمرہ کی کل دنیا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور دنیا وہاں موجود نہیں۔ لیکن جب کمرہ میں رکھا ہوا ٹیلی وژن سٹ کھولا جاتا ہے تو اچانک معلوم ہوتا ہے کہ ہماری اسی دنیا کے اندر ایک اور دنیا اپنے تمام اجزاء کے ساتھ موجود تھی۔ اس میں حرکت تھی، آوازیں تھیں۔ اس میں انسان جیسی ہستیاں تھیں۔ اس میں واقعات ہو رہے تھے۔ یہ سب مکمل طور پر موجود تھا مگر وہ دیکھنے والوں کے لئے غیر موجود بنا ہوا تھا۔ جب ٹیلی وژن کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ ہماری محسوس دنیا کے اندر ایک اور مکمل دنیا موجود تھی۔ اگرچہ اس سے پہلے وہ ہم کو دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

یہ ایک معلوم مثال ہے جس سے آخرت کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہماری دنیا ایک دہرا وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں ہماری محسوس دنیا کے اندر ایک اور دنیا چھپی ہوئی ہے۔ یہ آخرت کی دنیا ہے۔ ہم اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ نظر آنے والی دنیا میں گزارتے ہیں۔ اس کے بعد موجودہ دنیا میں ہماری آنکھ بند ہو جاتی ہے اور ہم کو ایک اور دنیا میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ وہ آئندہ آنے والی دنیا میں کامیابی حاصل کرے۔ کیوں کہ وہ دنیا ابدی بھی ہے اور حقیقی بھی۔ اُس دنیا کی تکلیفوں اور راحتوں کے مقابلہ میں موجودہ دنیا کی تکلیفوں اور راحتوں کی کوئی حقیقت نہیں۔

موجودہ دنیا میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ مگر یہ آزادی صرف اس لئے ہے کہ انسان حالت امتحان میں ہے۔ یہاں آدمی کو جانچ کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا ہے، کون برا۔ اس جانچ کے لئے آزادانہ فضا ضروری تھی۔ ضروری تھا کہ آدمی کو اس بات کا کھلا موقع دیا جائے کہ وہ جس طرح چاہے رہے اور جس قسم کی چاہے زندگی گزارے۔ موجودہ ابتدائی دنیا اسی خاص ضرورت کے تحت خاص ڈھنگ سے بنائی گئی ہے۔ وہ تمام حالات یہاں جمع کئے گئے ہیں جو کسی آدمی کو عمل کا موقع دینے اور اس کے بعد اس پر حجت قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس طرح لوگوں کو کسوٹی پہ رکھ کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اگلی دنیا میں عزت کی جگہ دیئے جانے کے قابل ہے اور کون اپنے ظلم اور نالائقی کی بنا پر اس کا مستحق ہے کہ اس کو ذلت کے گڑھے میں ڈال دیا جائے۔ موجودہ دنیا میں دونوں قسم کے آدمی ملے جلے ہیں۔ آخرت کی دنیا میں دونوں کو ان کے آج کے ریکارڈ کے مطابق چھانٹ دیا جائے گا۔ ایک طرف تکلیفوں اور مصیبتوں کا جہنم ہوگا اور برے لوگوں کو اس میں پُر عذاب زندگی گزارنے کے لئے ڈال دیا جائے گا۔ دوسری طرف ہر قسم کی راحتوں اور خوشیوں کی جنت ہوگی اور نیک لوگوں کو اس کا دائمی وارث بنا دیا جائے گا کہ وہ اس میں اپنا ٹھکانا بنائیں اور خوشیوں بھری زندگی گزاریں۔

اب آخرت کے مسئلہ کو ایک اور پہلو سے دیکھئے۔

کسی درخت پر کوئی پتھر اٹکا ہوا ہے، آپ اس کے نیچے سے گزرے، یکایک پتھر آپ کے اوپر گرا اور آپ کا سر ٹوٹ گیا، کیا آپ اس درخت پر خفا ہوں گے اور اس سے لڑائی کریں گے۔ نہیں، بلکہ خاموشی سے اپنا سر پکڑے ہوئے گھر چلے جائیں گے یا اسپتال جا کر اپنا علاج کرائیں گے۔ اس کے برعکس اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر آپ کے اوپر ایک پتھر کھینچ مارے اور آپ کا چہرہ زخمی ہو جائے تو آپ اس کے اوپر برس پڑتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کا بھی سر توڑ ڈالیں جس طرح اس نے آپ کا سر توڑا ہے اور اگر خود اس کا سر توڑ نہیں سکتے تو معاملہ کو عدالت میں لے جاتے ہیں اور وہاں اس کو قانون کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔

اسی طرح ایک اور مثال لیجئے۔ آم کا ایک بڑا درخت ہے جس پر فصل کے موقع پر ہزاروں کی تعداد میں پھل آتے ہیں۔ یہ پھل پکتے ہیں اور ایک ایک کرکے گر جاتے ہیں یا توڑ لئے جاتے ہیں، خود آم اپنے ایک پھل کو بھی نہیں کھاتا، مگر کوئی شخص کبھی یہ کہتا ہوا نہیں سنا گیا کہ "افسوس کہ آم نے اتنے پھل پیدا کئے مگر وہ خود اپنے پھل کو نہ کھا سکا"۔ اس کے برعکس ایک آدمی زندگی بھر کی کمائی سے اپنے لئے ایک شاندار مکان بنائے اور مکان کی تعمیر مکمل ہوتے ہی مر جائے تو ہر دیکھنے والا شخص کہے گا کہ کیسا افسوسناک ہے یہ واقعہ کہ آدمی نے محنت کرکے ایک گھر بنایا اور اس کے اندر رہنا اس کو نصیب نہ ہوا۔

معلوم ہوا کہ درخت اور انسان میں بہت بڑا فرق ہے، درخت کوئی "برائی" کرتا ہے تو اس کو اس برائی کی سزا نہیں دی جاتی۔ اسی طرح درخت کوئی "نیکی" کرتا ہے تو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس کو اس کی نیکی کا انعام دیا جائے، جب کہ انسان کے لئے ہم دونوں چیزیں چاہتے ہیں۔ ہمارا ذہن پکارتا ہے کہ انسان کوئی برا عمل کرے تو اس کو ضرور اس کی سزا دی جائے اور انسان کوئی اچھا عمل کرے تو ضرور اس کو اس کا انعام ملے۔

سارے انسانوں کی فطرت یہی مانگ رہی ہے اور تمام علوم متفقہ طور پر اس کی اہمیت کی تصدیق کرتے ہیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ یہی چیز اس دنیا میں حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ہٹلر نے ایک ایسی جنگ چھیڑی جس میں پانچ کروڑ آدمی ہلاک ہو گئے۔ کیا کوئی بھی حکومت ہٹلر کو اس کے اس جرم کی سزا دے سکتی ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ہٹلر کو گولی مار کر ختم کر دیں حالانکہ یہ جرم اتنا بڑا ہے کہ ہٹلر اگر ۵ کروڑ بار زندہ ہو اور ۵ کروڑ بار گولی مار کر ہلاک کیا جائے تب بھی اس کی سزا مکمل نہیں ہوگی۔ پھر یہ معاملہ ہٹلر اور اسٹالن جیسے ظالموں کا ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک معمولی آدمی بھی جب کوئی جرم کرتا ہے تو اس کے جرم کے اثرات اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ نہ کوئی دنیوی عدالت اس کے سارے پہلوؤں کی تحقیق کر سکتی اور نہ کوئی جیل خانہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دے سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص جو اس دنیا میں کوئی جرم کرتا ہے، وہ اپنے جرم کی حقیقی سزا پائے بغیر مر جاتا ہے۔ حالانکہ ساری انسانیت پکار رہی ہے کہ اس کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دی جائے۔

یہی معاملہ انعام کا بھی ہے۔ ایک شخص کو اقتدار ملے مگر اقتدار پا کر وہ فرعون نہ بنے بلکہ عام

انسانوں کی طرح اپنے کو ایک انسان سمجھے اور اقتدار کو لوگوں کی حقیقی خدمت میں لگائے، کیا اس دنیا میں اس کو اس عمل کا بدلہ دیا جاسکتا ہے۔ ایک شخص اپنی محنت سے دولت کمائے اور اس دولت کو غریبوں اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں صرف کردے کیا اس کو اس عمل کا انعام دینا ممکن ہے۔ ایک شخص علم میں کمال پیدا کرتا ہے اور اس علم کو انسانیت کی تعمیر میں لگا دیتا ہے، کیا اس کو اس خدمت کا معاوضہ دیا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک شخص کے ایک چھوٹے سے نیک عمل کا انعام دینا بھی اس دنیا کے محدود حالات میں ممکن نہیں۔ جس طرح ایک بُرا عمل بے شمار طریقوں سے انسان کے لئے مصیبت بنتا ہے۔ اسی طرح ایک نیک عمل بے شمار طریقوں سے انسانیت کے لئے خیر و فلاح کا باعث ہوتا ہے۔ کون ہے جو اس کے اعداد و شمار جمع کرسکے اور اس کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دے۔

اسی کے ساتھ ایک بات اور بھی ہے۔ اس دنیا میں آدمی بیماری، بڑھاپا، موت اور اس طرح کے دوسرے ناموافق قوانین سے بندھا ہوا ہے۔ بالفرض کسی کے حسن عمل کا اندازہ کرکے اس کے لئے اس کے کارناموں کے مطابق ایک "جنت" بنا دی جائے، جب بھی وہ اس سے حقیقی طور پر لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ بے شمار انسانوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں بالفرض کسی کو مسرت مل جائے، جب بھی وہ چند لمحات سے زیادہ اس کا لطف نہیں اُٹھا سکتا۔ ہر انسان اپنے لئے ایک "جنت" چاہتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں جنت نہیں بن سکتی۔ جنت بنانے کے لئے کوئی اور دنیا درکار ہے جو موجودہ دنیا کی محدودیتوں اور نقائص سے پاک ہو۔

یہ صورت حال پکار رہی ہے کہ موجودہ دنیا نامکمل ہے اور اس دنیا کی تکمیل کے لئے ایک اور دنیا وجود میں آنی چاہئے۔

جب ہم کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ بے پناہ حد تک وسیع معلوم ہوتی ہے۔ اس کے امکانات لامحدود ہیں۔ یہ زمین، جس پر انسان اپنی زندگی بناتا ہے، وہ عظیم کائنات کے اتھاہ امکانات کا ایک بے حد حقیر حصہ ہے۔ ہماری زمین، کائنات کا اس سے بھی زیادہ چھوٹا حصہ ہے جتنا سارے سمندروں کے کنارے پائی جانے والی ریت کے مقابلہ میں ایک ذرہ۔

کائنات نے اپنے اتھاہ امکانات میں سے صرف ایک حقیر جزو ہی کو زمین پر کیوں ظاہر کیا۔ آخرت کا عقیدہ اسی سوال کا جواب ہے۔ انسان کے لئے یہاں جو امکانات ہیں، ان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ موجودہ دنیا میں ہم کو مل رہا ہے اور اس کا آخری اور کامل حصہ آخرت کی دنیا میں دیا جائیگا۔

اللھم لا عیش الا عیش الآخرۃ (خدایا زندگی صرف آخرت کی زندگی ہے) حدیث کے یہ الفاظ صرف ناکام ونامراد لوگوں کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ان لوگوں پر بھی پوری طرح صادق آتے ہیں جن کو دنیا میں ہر قسم کے بہترین مواقع ملے۔ جنھوں نے سمجھا کہ وہ اپنی خوشیوں کی بہار اسی دنیا میں دیکھ سکتے ہیں۔ مگر موت عین اس وقت ان کی تمناؤں کے محل کو ڈھا دیتی ہے جب کہ وہ اس کے دروازے پر پہنچ چکے ہوتے ہیں۔

آدمی دنیا کے دوسرے بہتر حصہ کو نہیں دیکھتا اس لئے وہ اپنی زندگی کی معنویت کو سمجھ نہیں پاتا۔ اگر وہ آخرت کو جان لے تو اس کو معلوم ہو کہ ایک مکمل اور ابدی دنیا یہاں موجود ہے۔ وہ اپنی مطلوب دنیا کو بھی پالے اور اپنی توجہات کے صحیح مرکز کو بھی۔

"ہماری دنیا مکمل کیوں نہیں"

آدمی اس سوال کا جواب نہیں پا سکتا

جب تک وہ آخرت کی دنیا کو نہ جان لے

۱۶ سالہ نندنی اپنے وجے نگر کے مکان میں آئینہ کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے نظر آیا کہ اس کی نازک گردن پر ایک گومڑا ابھر رہا ہے۔ "زندگی زیادہ مکمل اور بےعیب کیوں نہیں"، اس نے اپنے دل میں کہا۔ وہ ایک کامیاب رقاصہ تھی اور اپنی دو ہم پیشہ بہنوں (پدما اور جے شری) کے ساتھ ابھی ابھی کشمیر کے ایک رنگارنگ سفر سے یہ حوصلہ لے کر واپس آئی تھی کہ وہ اپنے پیشہ میں اور زیادہ توجہ دے کر اعلیٰ ترین رقاصہ بنے گی۔ اپنی بہنوں کے ساتھ اس نے ملک کے مختلف شہروں میں رقص کے ۵۰ مظاہرے کئے تھے۔ تینوں بہنیں "وجے نگر سسٹرس" کے نام سے مشہور ہو گئی تھیں۔ تاہم کل کی تقریب میں شرکت سے اس نے معذوری ظاہر کر دی۔ بدنما گردن کے ساتھ وہ آرٹ کی محفل میں کیسے شریک ہو سکتی تھی۔

مگر خلاف امید اس کا گومڑ بڑھتا گیا۔ گھر والوں کو پریشانی ہوئی۔ ڈاکٹروں اور اسپتالوں کی دوڑ شروع ہو گئی۔ بالآخر صرف یہ جاننے کے لئے کہ ان کی نندنی کینسر کے ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اسپتال میں داخلہ کے نویں دن اس کی موت کا پیغام آ گیا۔ بستر پر ایک بے حس وحرکت جسم پڑا ہوا تھا اور دوست اور رشتہ دار چاروں طرف اس کو گھیرے ہوئے یہ سوچ رہے تھے "وہ ہنستی ہوئی روح آخر کہاں چلی گئی"۔

یہ جولائی ۱۹۶۹ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد نندنی کی بقیہ دو بہنوں نے "نرتیہ نندنی" کے نام سے ایک ڈانس اسکول کھولا۔ زندہ رہنے کے لئے کوئی مشغولیت ضروری تھی۔ دونوں باصلاحیت بہنوں کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ ان کو موقع ملا کہ وہ یورپ کے شہروں لندن، جنیوا، فرینکفرٹ، برلن، ایمسٹرڈم، پیرس وغیرہ میں اپنے کمال فن کی داد لے سکیں۔ ان کو اپنے پیشہ میں اتنی کامیابی ہوئی کہ ایک اخبار نے لکھا:

The gods of India can smile when the bells on the Vijayanagar sisters tinkle

Why life could not have been more perfect

ہندوستان کے دیوتا مسکرا اٹھتے ہیں جب وجے نگر بہنوں کے گھونگرو بجتے ہیں۔

فروری ۱۹۷۳ میں دونوں "رقص رانیوں" کی شادی روایتی جشن کے ساتھ ہو گئی۔

شادی کے صرف دو دن بعد جے شری کے آئینہ نے بتایا کہ اس کی ٹھوڑی کے پاس ایک گومڑا ابھر رہا ہے۔ دواؤں اور آپریشن کے بعد گھر والوں نے سمجھا کہ ان کی جے شری اچھی ہو چکی ہے۔ مگر مقررہ جگہ پر درد کا باقی رہنا جے شری کو پریشان کئے ہوئے تھا۔ "بے وقوف نہ بنو جے شری"، ڈاکٹر نے کہا "تمہارے جیسی جوان اور تندرست عورت کو کینسر کس طرح ہو سکتا ہے"۔ اس کے بعد گومڑ کا ایک ٹکڑا ٹاٹا میموریل اسپتال (بمبئی) کو جانچ کے لئے بھیجا گیا۔ رپورٹ نے بتایا کہ نندنی کے بعد اب اس کی بہن کو بھی کینسر ہو چکا ہے۔ مرض ٹھوڑی اور سینہ سے گزر کر پیروں تک پہنچ گیا۔ ہر قسم کے بہترین علاج کے باوجود تکلیف بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸ مارچ ۱۹۷۴ کو جے شری کی روح بھی ایک بھیانک جسم کو بستر پر چھوڑ کر اس سے جدا ہو گئی۔

"وجے نگر سسٹرس" کا جگمگاتا ہوا مکان اب تاریک ہو چکا ہے۔ دو جوان لڑکیوں کے کھونے کے بعد ماں باپ کو زندگی بے معنی نظر آتی ہے۔ ہر طرف مایوسی پھیلی ہوئی ہے۔ "نرتیہ نندنی" اسکول اگرچہ نومبر ۱۹۷۵ سے "جے شری آرٹس انٹرنیشنل" میں تبدیل ہو چکا ہے۔ مگر تیسری بہن پدما اپنی ظاہری کامیابیوں کے باوجود ہر آن اپنے کو اسی راستہ پر پاتی ہے جدھر اس سے پہلے اس کی دو محبوب بہنیں جا چکی ہیں۔ وہی سوال اس کو بھی بے چین کئے ہوئے ہے جس کو لے کر اس کی دونوں بہنیں اس دنیا سے چلی گئیں۔ "زندگی زیادہ مکمل اور بے عیب کیوں نہیں"۔ اس کی نفسیاتی حالت کو رپورٹر (مسٹر ایس۔ گنگولی) نے ایک جملہ میں اس طرح ادا کیا ہے:

A PSYCHOLOGICAL AMPUTATION IS NO LESS REAL THAN A PHYSICAL ONE.

Eve's Weekly (Bombay) 2.6.1978

نفسیاتی قتل کسی بھی حال میں جسمانی قتل سے کم نہیں ہوتا۔

اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان (۸۵ - ۲۳ ھ) کا انتقال ہوا تو اس کے ایک بیٹے نے یہ شعر پڑھا:

وَما کان قیس هلکه هلك واحد   ولکنه بنیان قوم تهدما

قیس کی موت ایک شخص کی موت نہیں۔ بلکہ قوم کی بنیاد گر گئی ہے۔

عبد الملک کے بیٹے ولید بن عبد الملک (۹۶ - ۵۰ ھ) نے سنا تو اس نے اپنے بھائی کو تنبیہ کی اور کہا کہ یہ تو مایوسی کی باتیں ہیں تم کو یوں کہنا چاہئے۔

اذا سید منا خلا قام سید   قؤل لما قال الکرام فعول

جب ہمارا کوئی سردار اٹھ جاتا ہے تو دوسرا سردار اس کی جگہ لے لیتا ہے جو قول و عمل میں ہمارے بڑوں کا جانشین ہوتا ہے

عن ابی اُمامۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ یقول: ما استفاد المومن بعد تقوی اللہ خیراً لہ من زوجۃٍ صالحۃٍ ان امرھا اطاعتہ وان نظر الیہا سرتہ و ان اقسم علیہا ابرتہ وان غاب عنہا نصحتہ فی نفسہا ومالہ

(ابن ماجہ)

ابو امامہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ کے خوف کے بعد مومن جو سب سے بہتر چیز پاتا ہے وہ ایک صالح بیوی ہے۔ اگر وہ اس سے کوئی بات کہتا ہے تو وہ اس کی تعمیل کرتی ہے۔ اگر وہ اس کی طرف دیکھتا ہے تو وہ اس کو خوش کر دیتی ہے۔ اگر وہ اس کے اوپر کوئی قول دے دیتا ہے تو وہ اس کو پورا کرتی ہے اگر وہ اس سے دور ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کی اور اس کے مال کی حفاظت کرتی ہے۔

oooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooo

● مکمل عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کی مکمل رفیق بن سکے ●

فرینک بورمن (FRANK BORMAN) ایک امریکی خلاباز ہیں۔ انھوں نے ایک ایسی خلائی کشتی میں پرواز کیا تھا جس میں ان کے علاوہ ایک خاتون خلاباز بھی سوار کرائی گئی تھی۔ مسٹر بورمن نے ایک بیان میں کہا:

HAVING WOMEN ON SPACE-CRAFT WAS OKAY EXCEPT THAT IT WOULD BE UPSETTING TO PUT A MALE AND A FEMALE TOO CLOSE TOGETHER FOR A LONG TIME.

خلائی کشتی میں عورت کو بٹھانا اچھا ہے۔ البتہ ایک عورت اور ایک مرد کو دیر تک اتنا زیادہ قریب رکھنا ابتری کا باعث ہوگا

مسٹر بورمن کے اس بیان نے مساوات مرد و زن کے بہت سے علم برداروں کو بوکھلا دیا ہے۔ ایک امریکی خاتون نے اپنی پر جوش تقریر میں کہا:

"مسٹر فرینک بورمن کا وجود کہاں ہوتا اگر ان کے ماں اور باپ اکٹھا نہ ہوتے ہوتے"

سائنسی تحقیقات نیز عملی زندگی کے حقائق نے مساوات مرد و زن کے قدیم تصور کو سخت جھٹکا پہنچایا ہے۔

ایک امریکی خاتون مسز مارگن (MARABEL MORGAN) دو بچوں کی ماں ہیں۔ انھوں نے حال ہی ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے: مکمل عورت (TOTAL WOMAN)

اس کتاب میں انھوں نے اپنی امریکی بہنوں کو "خوش گوار ازدواجی زندگی" کے لئے یہ سادہ گر بتایا ہے:

BE NICE TO YOUR HUSBAND, STOP NAGGING HIM AND UNDERSTAND HIS NEEDS.

اپنے شوہر کی اچھی رفیق بنو۔ اس کو ملامت کرنا چھوڑ دو، اس کی ضرورتوں کو سمجھو۔

یہ کتاب ایک سال سے بھی کم عرصہ میں تین ملین کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہے۔ موصوفہ کے نزدیک مرد کی رفیق بننا عورت کی تکمیل ہے نہ کہ آزادانہ زندگی کا مالک بننا۔ (ٹائمس آف انڈیا۔ ۸ فروری ۱۹۷۸)

مسلمان آسٹریلیا میں

۱۸۶۰ء میں ایک مسلمان آسٹریلیا میں داخل ہوا تھا۔ آج آسٹریلیا میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے۔ ملک میں جگہ جگہ نئی نئی مسجدیں بن رہی ہیں۔ ابتدا میں جو مسلمان آسٹریلیا پہنچے وہ شتربان CAMEL DRIVER تھے جو اونٹوں کی نگہداشت اور ساربانی کے لئے یہاں لائے گئے تھے۔ ۸۰ سال سے زیادہ عرصہ تک مسلمان اسی حیثیت سے آسٹریلیا میں رہے۔

پہلا مسلمان شخص جو آسٹریلیا پہنچا، اس کا نام دوست محمد تھا۔ وہ ایک کشمیری پٹھان تھا۔ اس کے ساتھ ۲۴ اونٹوں کا قافلہ ہوتا تھا اور وہ ملبورن اور برک کے درمیان اونٹوں کے ذریعہ سواری اور باربرداری کا کام کیا کرتا تھا۔ ۱۸۶۶ء میں سر ٹامس ایلڈر نے ۱۲۰ اونٹوں کا قافلہ بنایا۔ اس کو ساربانوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے کراچی سے ۱۲ ساربانوں کو بلایا۔ اسی طرح افغانستان، ہندوستان اور موجودہ پاکستان سے ساربانی کے کام کے لئے مسلمان آسٹریلیا پہنچتے رہے ۔

آسٹریلیا کے لوگ ان مسلمانوں کو عام طور پر "افغان" کہتے تھے جو مختصر ہوتے ہوتے بالآخر صرف غان (GHANS) رہ گیا۔ اونٹوں کے ذریعہ سواری اور باربرداری کا کام اتنا بڑھا کہ ایک بار بیک وقت پانچ سو اونٹ باہر سے منگوائے گئے۔ یہ ساربان اپنے مخصوص پیشہ کے ساتھ بعض معمولی تجارتی کام بھی آسٹریلیا میں کرتے تھے۔

اونٹوں کے قافلے زیادہ تر ایڈیلیڈ، فارینا، ماری اوڈناڈٹا اور الائس کے راستوں پر چلتے تھے۔ اس پورے راستہ میں ان لوگوں نے جگہ جگہ عبادت کے لئے مسجدیں بنالیں۔ اسی طرح دوسرے جن راستوں پر وہ چلتے تھے، وہاں وہ مسجد بھی بنا لیتے تھے۔ یہ لوگ ہمیشہ اپنے ساتھ چٹائیاں بھی رکھتے اور جہاں مسجد نہ ہوتی ، راستہ کے کنارے چٹائی بچھا کر نماز پڑھ لیتے۔

۱۸۷۰ء کے بعد آسٹریلیا کے صحراؤں میں ریلوے لائن کا منصوبہ بنا اور بالآخر ٹرانس آسٹریلیا ریلوے وجود میں آئی۔ اس ریلوے لائن کے لئے سروے کا جو کام برسہابرس تک ہوتا رہا، اس میں مسلم ساربانوں کے اونٹ بہت کارآمد ثابت ہوئے۔ ان اونٹوں کے ذریعہ

آسٹریلیا کا بڑا حصہ صحرا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب کہ یہاں ریلوے لائن نہیں تھی، صحرائی جہاز (اونٹ) یہاں کے راستوں کو طے کرنے کے لئے بہت مفید سمجھے گئے۔ صحرائی براعظم کی اس ضرورت نے مسلمانوں کو آسٹریلیا میں روزگار فراہم کئے۔ مگر جب آسٹریلیا میں ریلوے لائن بچھ گئی تو اس کے بعد مسلمانوں کے لئے وہاں کوئی روزگار نہ رہا۔ روایتی ماحول میں اونٹوں کی نکیل تھامنے کا کام تھا اور مسلمان اس کی بخوبی مہارت رکھتے تھے۔ غیر روایتی ماحول میں مشینوں کا ہینڈل پکڑنا تھا، مسلمان اپنے کو اس کا اہل ثابت نہ کر سکے ——— قدیم دنیا میں جو لوگ انسانی قافلوں کے آگے چلتے تھے، جدید دنیا میں وہ صرف پیچھے چلنے والے ہو کر رہ گئے۔

سرکاری کارکن اور سامان صحراؤں میں سفر کرتے تھے۔ مگر جب ریلوے لائن بن گئی تو یہی ریلوے تھی جس نے آسٹریلیا میں اونٹوں کو اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کو بے جگہ کر دیا۔ اس کے بعد یہ کاروبار ختم ہونے لگا۔ مسلمان آسٹریلیا سے رخصت ہونے لگے۔ آذرمان خاں آخری مسلمان تھا جو ۱۹۵۰ میں آسٹریلیا کو چھوڑ کر اپنے وطن کراچی واپس آگیا۔ اس نے تقریباً ۵۰ سال آسٹریلیا میں گزارے۔

پھر بھی بعض خوش قسمت مسلمانوں کو آسٹریلیا میں روزگار ملتا رہا۔ مثلاً ۱۹۷۵ میں آسٹریلیا کی حکومت نے فیصلہ کیا کہ وہ چار اونٹ شاہ خالد (سعودی عرب) کی خدمت میں پیش کرے۔ اس کے لئے حکومت نے محمد عالم اور صالح محمد کی خدمات حاصل کیں، جنھوں نے سمپسن صحراؤں سے چار جنگلی اونٹ پکڑے اور ان کو تربیت دے کر اس قابل بنایا کہ وہ سعودی حکمراں کو بطور تحفہ پیش کئے جا سکیں۔

مسلم ساربانوں کی خاص شاہراہ وہ تھی جو ایڈیلیڈ سے الائس اسپرنگ کو جاتی ہے۔ اس راستہ پر اب جدید وضع کی ٹرینیں دوڑتی ہیں۔ تاہم قدیم "افغانی ساربانوں" کے نام پر اس کا نام غان (THE GHAN) رکھا گیا ہے۔ اس قسم کی اور بھی یادگاریں ہیں۔ ایڈیلیڈ میں "افغانوں" نے ۱۸۸۹ میں ایک مسجد بنائی تھی۔ اس علاقہ میں اب اگرچہ مسلمان نہیں ہیں۔ مگر بروکن ہل ہسٹاریکل سوسائٹی نے ۱۱۵ سال بعد بھی اب تک اس کو محفوظ رکھا ہے۔ اب مسجد کے ساتھ جلد ہی "افغان میموریل ہال"، حکومت کے اہتمام میں بننے والا ہے۔ یہ ہال اور اس قسم کی دوسری

مغربی دنیا میں اسلام

پہلے "اونٹوں" کے ذریعہ داخل ہوا تھا

اب وہ یہاں "پٹرول" کے ذریعہ

داخل ہو رہا ہے

چیزیں دراصل اس بات کا نشان ہیں کہ آسٹریلیا مسلم ملکوں خاص طور پر عربوں سے تعلقات بڑھا رہا ہے۔ پٹرول نے آج کی دنیا میں عربوں کی اہمیت بڑھا دی ہے اور اسی کے ساتھ اسلام کی بھی۔

۱۹۵۱ سے مسلمانوں کی نئی قسم آسٹریلیا میں داخل ہونا شروع ہوئی ہے۔ یہ مختلف مسلم ملکوں کے طلبہ ہیں۔ ۱۹۷۸ میں ان کی تعداد تقریباً پانچ ہزار تھی۔ اسی طرح مسلم سفارت خانوں کا عملہ بھی مسلمانوں کی تعداد بڑھا رہا ہے۔ برسبین (BRISBANE) میں ۱۹۰۷ میں ایک مسجد بنائی گئی تھی جو اب خستہ حالت میں تھی۔ اب یہاں کے مسلم طلبہ نے اس کی نئی تعمیر کا منصوبہ بنایا — اس کی لاگت کا اندازہ ۷۵ ہزار آسٹریلیائی ڈالر تھا۔ مسجد ۱۹۷۰ میں بن کر تیار ہو گئی مگر اس کی لاگت اصل اندازہ کے مقابلہ میں صرف نصف ہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقامی مسلمانوں نے رضاکارانہ طور پر مزدوروں کا کام کیا۔

سڈنی نہ صرف آسٹریلیا کا سب سے بڑا شہر ہے بلکہ یہاں مسلم آبادی بھی سب سے زیادہ ہے، یہاں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۵۰ ہزار ہے۔ آسٹریلیا کی سب سے بڑی مسجد بھی جلد ہی یہاں مکمل ہو جائے گی۔ اس کی لاگت کا اندازہ پانچ لاکھ آسٹریلیائی ڈالر ہے۔ اسی طرح ملبورن میں پانچ لاکھ آسٹریلیائی ڈالر کی لاگت سے ایک مسجد تیار ہوئی ہے۔ اس کی لاگت زیادہ تر بیرونی مسلم ملکوں کے عطیات سے پوری کی گئی ہے۔ مثلاً صباح، سعودی عرب، بحرین، کویت۔

سعودی عرب نے آسٹریلیا میں مساجد کی تعمیر کے لئے خصوصی طور پر پچاس ہزار ڈالر کی رقم دی ہے۔ آسٹریلیا کے مختلف مقامات پر جو مساجد ہیں، ان کا نقشہ یہاں دیا جا رہا ہے۔

یہ معلومات آسٹریلین ہائی کمیشن کے ایک بلیٹن سے لی گئی ہیں جو اپریل ۱۹۷۸ میں دہلی سے شائع کیا گیا ہے۔ بلیٹن کا عنوان ہے:

MUSLIMS IN AUSTRALIA

کائنات میں ماورائے انسان ذہانت کے آثار مل رہے ہیں

آج کل سائنسی حلقوں میں بالائے خلا ذہانت (Extraterrestrial Intelligence) کا بہت چرچا ہے۔ مختلف شعبوں میں ایسے شواہد سامنے آرہے ہیں جو اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ زمین کے علاوہ خلا کے دوسرے حصوں میں بھی ذہین ہستیاں، اغلباً انسان سے زیادہ ذہین موجود ہیں۔ حتیٰ کہ بہت سے سائنس داں اس سنہری صبح کے منتظر ہیں جب کہ وہ خلائی ریڈیو کا پیغام (Extraterrestrial Radio Message) وصول کر سکیں گے۔

بالائے خلا ذہانت سے سائنس دانوں کی مراد یہ ہوتی ہے کہ زمین کے علاوہ کائنات کے دوسرے مقامات پر بھی ہماری جیسی مخلوقات پائی جاتی ہیں۔ دو امریکی فلکیات دانوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ہماری کہکشاں میں ۔ اببلین ستارے ایسے ہیں جو نظام شمسی کی کی مانند سیاراتی نظام رکھتے ہیں۔ ان نظامات میں زندگی کا وجود اسی طرح ممکن ہے جس طرح موجودہ زمین پر۔ اگرچہ عملاً ابھی تک ایسا کوئی کرہ دریافت نہیں ہوا ہے جہاں زمین جیسی زندگیاں پائی جاتی ہوں۔

سائنسی دریافتوں کا قافلہ بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ سائنس ماورائے انسان "ذہانت" تک پہنچ چکی ہے۔ اگر کسی دن وہ دریافت کرے کہ یہ ماورائے انسان ذہانت اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنی زیادہ ممتاز ہے کہ اس کو انسان جیسی ذہین ہستی کہنے کے بجائے "خدا" کہنا زیادہ صحیح ہوگا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

oooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooo

یہ داستانیں

مشہور ہے کہ مہلہل کے یہاں جب اس کی لڑکی لیلہ پیدا ہوئی تو اس نے اس کو زندہ درگور کر دینے کا حکم دے دیا۔ مگر بچی کی ماں نے اس کو چھپا دیا۔ رات کو مہلہل نے خواب دیکھا کہ ایک شخص اس کو بتا رہا ہے کہ اس کی لڑکی ایک قابل لڑکا جنے گی۔ صبح ہوئی تو اس نے لڑکی کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ اس کو بتایا گیا کہ وہ اس کے حکم کے مطابق زندہ دفن کر دی گئی ہے۔ مہلہل نے نہ مانا۔ اس نے مزید اصرار شروع کیا۔ آخر کار لڑکی اس کے سامنے پیش کی گئی۔ اس نے حکم دیا کہ اس کو عمدہ غذائیں کھلائی جائیں۔

اس لڑکی کی شادی کلثوم سے ہوئی۔ اب لڑکی اکثر خواب دیکھنے لگی کہ کوئی شخص آتا ہے اور اس کے ہونے والے بچہ کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بتاتا ہے۔ بالآخر اس کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ یہی وہ مشہور شاعر ہے جس کو دنیا عمرو بن کلثوم کے نام سے جانتی ہے۔

تاریخ ادب کے ناقدین اس قصہ کو من گھڑت کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ قصہ عمرو بن کلثوم کی شہرت کے بعد فرضی طور پر بنا لیا گیا ہے۔ مگر اسی قسم کے، اس سے زیادہ من گھڑت قصے "بزرگوں" کے بارے میں تصنیف کر لئے گئے ہیں اور ان کو لوگ اس طرح پڑھتے اور سنتے ہیں جیسے وہ وحی آسمانی ہو۔ جس چیز کے ساتھ تقدس کا عنصر شامل ہو جائے وہ ہر جانچ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ بالکل بے اصل کہانیوں کو لوگ اس طرح ماننے لگتے ہیں جیسے وہ کوئی حقیقی تاریخ ہو۔

مارچ ۱۹۷۸ کے آخر میں ریاست جموں وکشمیر کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اس سلسلے میں جموں، راجوری اور تھنہ منڈی جانا ہوا۔ زیادہ قیام تھنہ منڈی میں رہا۔ یہاں کی جامع مسجد میں ایک تقریب ہوئی جس میں مقامی لوگوں کے علاوہ اطراف کی بستیوں سے آئے ہوئے لوگ بھی شریک تھے۔ تھنہ منڈی میں تین دن (۳۰-۳۱ مارچ، یکم اپریل) گزرے۔ بستی کے بیش تر پڑھے لکھے لوگوں سے دینی امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ مدرسہ کاشف العلوم (قائم شدہ ۱۹۷۱) کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا جو جامع مسجد سے ملحق ہے۔ چند مخلص اور باہمت لوگ اس کو ترقی دینے میں مصروف ہیں۔

تھنہ منڈی ایک قصبہ ہے جو جموں کے اس حصہ میں واقع ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اقتصادی پس ماندگی اور جہالت عام ہے۔ اس سے بھی زیادہ بڑی بیماری وہ جذباتیت ہے جس میں کشمیری مسلمانوں کو وافر حصہ ملا ہے۔ توہماتی مذہب کا اتنا زور ہے کہ خدا سے بھی زیادہ "مدفون بزرگوں" کی پرستش ہوتی ہے۔ اس پر مزید اضافہ یہ کہ یہاں کی صحافت، قیادت اور مذہبی پیشوائی کو صورت حال کی اصلاح سے دل چسپی نہیں۔ وہ موجودہ صورت حال کو اپنے استحصال کی قیمتی زمین بنائے ہوئے ہیں۔

اس علاقہ کے مقبول اخبارات وہ ہیں جو ہر ہفتہ ان لوگوں کو جذباتی خبروں کی شراب پلاتے ہیں۔ یہاں کے مقبول پیشوا وہ ہیں جو بزرگوں کے طلسماتی قصے سنا کر ان کو جھوٹی تسلیوں کی ایک جنت میں غوطہ دیتے رہتے ہیں۔ یہاں کے قائدین وہ ہیں جو لفظ بازی کی سیاست میں ان کو اس طرح مدہوش رکھتے ہیں کہ حقیقت پسندانہ انداز سے سوچنے کا انھیں کبھی موقع ہی نہیں ملتا۔

اس اندھیرے میں امید کی صرف ایک کرن ہے۔ وہ یہ کہ ریاست میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک ایسا گروہ ابھر رہا ہے جو ان حالات سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہے۔ اس قسم کے فکر مند اور حقیقت پسند نوجوان ہر جگہ ابھر رہے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک مثبت علامت ہے اور قوی امید ہے کہ مستقبل قریب میں ضرور اس کے نتائج برآمد ہوں گے۔

راقم الحروف کے لئے اس سفر کی سب سے زیادہ خوش آیند بات یہی تھی۔ یہاں کے لوگوں نے ایک بڑے اجتماع کا منصوبہ بنایا تھا جس کا نام انھوں نے "اسلامی کنونشن" رکھا تھا اور اس کے اشتہارات بھی چھپوا لئے تھے۔ کنونشن کی مجلس انتظامیہ کے جو رکن دہلی آئے تھے کہ مجھ کو ساتھ لے کر جائیں، ان سے میں نے کہا کہ میں جلسوں اور کانفرنسوں کو ایک قسم کا جرم سمجھتا ہوں۔ ان مواقع پر جب کوئی میرے گلے میں ہار ڈالتا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگاروں کا طوق مجھے پہنا رہا ہے۔ پنڈال کی روشنیوں کو جب میں دیکھتا ہوں تو مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہنم کے شعلوں سے روشن کی گئی ہیں۔ جو ایڈریس مجھ کو دیا جاتا ہے، وہ ایسا لگتا ہے جیسے مجھ کو مجرم قرار دے کر میرے خلاف عدالت کی سزا سنائی جا رہی ہے۔ اس لئے اگر آپ وعدہ کریں کہ آپ وہاں اس قسم کی کوئی کارروائی نہیں کریں گے حتیٰ کہ جلسہ کی صورت ختم کر کے اس کو غور وفکر کی مجلس بنا دیں گے تو میں چلنے کے لئے تیار ہوں۔ وہ بخوشی اس کے لئے راضی ہو گئے اور اجتماع کی پوری نوعیت بدل دی۔ یہ اگرچہ ایک سہ روزہ اجتماع تھا۔ مگر بالکل نئی قسم کا اجتماع تھا۔

صرف جمعہ (۳۱ مارچ ۱۹۷۸) کی نماز سے پہلے ایک تقریر ہوئی۔ وسیع جامع مسجد پوری طرح بھری ہوئی تھی مقامی بستی کے علاوہ کثرت سے باہر کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اور کوئی عمومی تقریر نہیں ہوئی۔ قیام گاہ پر رات دن کثرت سے لوگ آتے رہے اور گفتگوئیں ہوتی رہیں۔ ان گفتگوؤں کا موضوع تمام تر آخرت، اور جنت اور جہنم ہوتا تھا۔ معروف قسم کے "ملی مسائل" پر کوئی گفتگو یا تقریر نہیں ہوئی۔

آج کل عام طور پر جس قسم کی کانفرنسوں کا رواج ہے، دور اول میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ یہ تمام تر بدعت ہے اور اسی لئے برکت اور افادیت سے بالکل خالی۔ دور اول میں جمعہ اور عیدین اور حج کے اجتماعات کو اسلامی اجتماع کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ جو چیز ہوتی تھی وہ ذکر و نصیحت کی مختصر غیر رسمی مجلسیں تھیں نہ کہ جگمگاتے پنڈالوں کی عظیم الشان کانفرنسیں۔

اس سفر کے تجربات میں سے ایک تجربہ یہ ہے کہ پریس اور پنڈال کے مقابلہ میں تذکیری مجلسیں کہیں زیادہ مفید ہیں۔ تحریر اور تقریر کے ذریعے سننے اور سنانے والے کے درمیان جو ربط قائم ہوتا ہے وہ بڑی حد تک مصنوعی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس تذکیری مجلسوں میں جو انفرادی گفتگوئیں ہوتی ہیں، وہ زیادہ بہتر طور پر آدمی کی نمائندہ ہوتی ہیں۔ کیوں کہ ان میں اس کی پوری شخصیت شامل

آدمی کے اندر حرارت ہو تو ایک جملہ بھی زندگی بدل دیتا ہے

مرزا محمد اعظم (پیدائش ۱۹۴۰) راجوری (جموں و کشمیر) میں فارسٹر ہیں۔ وہ باہر سے جب بھی گھر آتے تو اپنے بچوں کے لئے مٹھائی پھل وغیرہ لاتے۔ ستمبر ۱۹۷۵ کے ایک دن وہ گھر میں داخل ہوئے تو کسی وجہ سے بچوں کے لئے کچھ نہ لاسکے۔ حسب معمول بچے ان کے گرد جمع ہو گئے۔ جب معلوم ہوا کہ وہ کوئی کھانے پینے کی چیز نہیں لائے تو بچوں کو جھٹکا لگا۔ چھ سالہ ارشد محمود طارق نے اپنی پہاڑی زبان میں کہا:

" اگر تساں اساں وسطے کجھ نی آندہ پھر تس کھانے وسطے آئے "

یعنی اگر آپ ہمارے لئے کھانے کی کوئی چیز نہیں لائے تو پھر گھر کس لئے آئے ہو۔

یہ جملہ مرزا محمد اعظم صاحب کو تیر کی طرح لگ گیا "بہت جلد میں اسی طرح خدا کے یہاں جانے والا ہوں،" انھوں نے سوچا "اگر خدا یہ کہہ دے کہ میرے لئے تم کچھ نہیں لائے تو پھر یہاں کس لئے آئے ہو، تو میرے پاس کیا جواب ہوگا،" اس سے پہلے ان کی زندگی آزاد اور غیر مذہبی زندگی تھی۔ اس واقعہ نے ان کو بالکل بدل دیا۔ وہ جائز کمائی پر قناعت کرنے لگے۔ داڑھی رکھ لی۔ نماز روزے کی پابندی کرنے لگے حج کی سعادت حاصل کی۔ اپنے بچوں کے لئے دینی تعلیم کا انتظام کیا ——— آدمی کے اندر حرارت ہو تو ایک جملہ بھی زندگی کو بدل دینے کے لئے کافی ہے۔ اور اگر حرارت نہ ہو تو دلائل کا انبار بھی اسی طرح بے معنی ہو جاتا ہے جس طرح جانور کے آگے تقریر کا ریکارڈ بجانا۔

ہو جاتی ہے۔ پھر یہ گفتگو اگر کمرہ میں یا شہروں کی مصنوعی فضا میں نہ ہو بلکہ قدرت کے کھلے ماحول میں ہو تو اس کے اندر ایسی جان آجاتی ہے جو کسی اور طرح ممکن نہیں۔

ہم ڈاک بنگلہ کے لان میں بیٹھے ہوئے ہیں جو ایک پہاڑی کو کاٹ کر بلندی کے اوپر بنایا گیا ہے۔ ایک طرف برف پوش پہاڑیاں ہیں۔ دوسری طرف دریاؤں اور درختوں کا منظر ہے۔ سنہری دھوپ، نیلا آسمان، چشمے کی قدرتی موسیقی اور ان سب کے مجموعہ سے بننے والی آفاقی فضا۔ ان کے درمیان تذکیر اور سوال و جواب کی مجلس چل رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم خدا کی گود میں ہیں۔ قبل اس کے کہ مجیب کسی سائل کے سوال کا جواب دے، کائنات اپنی خاموش زبان میں بول پڑتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے خود کچھ نہیں کہنا ہے بلکہ کائنات کے ساتھ ہم زبان ہو کر خدائی پیغام کو دہرا دینا ہے۔ کائناتی زبان میں نشر ہونے والی بات کو انسانی زبان میں نقل کر دینا ہے ــــــ

اس تجربہ سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اسلامی دعوت کا کام کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ اس کو خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے درمیان بیٹھ کر انجام دیا جائے۔ انسانوں کی تعمیر کی ہوئی چھتوں یا شامیانوں کے نیچے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

"میں آپ کی تقریباً تمام مجلسوں میں شریک ہوتا رہا ہوں" یہاں قیام کے آخری دن ایک صاحب نے کہا "آپ ہر گفتگو میں خوف خدا اور فکر آخرت پر زور دیتے رہے ہیں۔ اگر دین یہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کے لئے اس دنیا میں کچھ نہیں۔ اس قسم کا ذہن تو آدمی کو نکما بنائے گا اور کم از کم آج کی دنیا کے لئے اس کو بے کار بنا کر رکھ دے گا"

میں نے کہا کہ یہ بات تجربہ سے ثابت نہیں ہوتی۔ اصحاب رسول سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والے اور آخرت کی فکر کرنے والے لوگ تھے۔ مگر ان کے اس جذبہ نے ان کو دنیا کا سب سے زیادہ متحرک گروہ بنا دیا۔ حتیٰ کہ انھوں نے تاریخ انسانی کو ایسی حرکت دی جیسی حرکت اس سے پہلے کسی قوم نے نہیں دی تھی۔

پھر میں نے کہا کہ خوف خدا کوئی منفی جذبہ نہیں۔ یہ انتہائی مثبت جذبہ ہے۔ اس کے بہت سے پہلوؤں میں سے ایک پہلو کو دیکھئے۔ دنیا میں کوئی بڑا انقلابی کام کرنے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے، وہ اتحاد ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہی چیز لوگوں میں سب سے کم پائی جاتی ہے اس کی وجہ ہے ایک دوسرے کے خلاف بغض و حسد اور نفرت و ضد کے جذبات پیدا ہو جانا۔ ایک شخص دوسرے کو کسی پہلو سے بڑھتا ہوا دیکھے تو اس کے خلاف حسد کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔ کسی سے کوئی شکایت ہو جائے تو آدمی کو اس سے دائمی بغض و نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگوں کو اپنی کمی نظر نہیں آتی البتہ دوسروں کی کمیوں اور خامیوں کو وہ خوب جانتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں ہیں جنھوں نے لوگوں کے دلوں کو ایک دوسرے سے پھاڑ رکھا ہے، وہ ایک دوسرے سے مل کر کام نہیں کر پاتے۔ آدمی اپنی بہترین طاقت دوسرے کو گرانے اور بدنام کرنے میں صرف کرتا ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنی قوتوں کو مثبت تعمیر کی راہ میں وقف رکھے۔ اس مزاج کے ساتھ دس کروڑ آدمی بھی بے قیمت ہیں۔ ان کی طاقت "دس کروڑ" نہیں بلکہ صرف ایک ہے کیوں کہ ہر آدمی اکیلا اکیلا ہے۔

اس قسم کے منفی جذبات کے خاتمہ کا واحد نسخہ خدا کا خوف ہے۔ خدا سے ڈرنے والے آدمی کی نظر دوسروں کی خامیوں کے بجائے اپنی خامیوں پر ہوتی ہے۔ وہ تنقید

سے بپھرتا نہیں بلکہ اس سے اپنی اصلاح کا سبق لیتا ہے۔ وہ آخرت کی بہتری کی خاطر دنیا کی شکایتوں کو نظر انداز کرتا رہتا ہے۔ وہ کسی کے خلاف بے انصافی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کو کھٹکا ہوتا ہے کہ آج اگر میں بے انصافی کردوں تو کل خدا مجھ کو بے نقاب کرکے سارے عالم کے سامنے رسوا کردے گا۔ وہ متکبرانہ روش اختیار نہیں کرتا۔ کیوں کہ وہ ہر معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھتا ہے نہ کہ اپنے جیسے انسانوں کا۔ وہ ایسا نہیں کرتا کہ اپنے لئے کچھ چاہے اور دوسروں کے لئے کچھ۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اس قسم کی دورنگی خدا کو پسند نہیں۔

خدا سے بے خوفی کے ماحول میں ہر آدمی دوسرے کی تخریب کاری میں مصروف رہتا ہے۔ اس کے برعکس خدا سے خوف کی فضا پیدا ہوجائے تو ہر آدمی کو دوسرے سے طاقت ملنے لگتی ہے۔ پورا گروہ اتحاد کی چٹان بن جاتا ہے۔ وہ نفسیاتی بیماریاں ختم ہوجاتی ہیں جو ایک کو دوسرے سے دور کرنے والی ہیں —— معاشرہ میں وسعت، فیاضی، بھائی چارہ، خیر خواہی اور حقیقت پسندی کا دور دورہ ہوجاتا ہے۔ جس گروہ میں یہ اوصاف پیدا ہوجائیں اس کی طاقت اتنی زیادہ ہوجاتی ہے کہ دنیا کا کوئی کام اس کے لئے مشکل نہیں رہتا۔ کوئی اس کو زیر نہیں کرسکتا۔

کیسی عجیب ہے وہ محرومی جو کامیابی کے چراغ جلاکر حاصل کی جارہی ہو

قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ کے پانچویں رکوع میں خدا کی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، جو زمین و آسمان میں بکھری ہوئی ہیں —— رات، دن، سورج، چاند، پانی، سبزہ وغیرہ۔ پھر ارشاد ہوا ہے:

"جو لوگ ہماری نشانیوں میں الحاد کرتے ہیں، وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں، کیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں ڈالا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن کے ساتھ آئے گا۔ جو جی چاہے کرلو، اللہ تمھاری تمام حرکتوں کو دیکھ رہا ہے (حم سجدہ — ۴۰)

الحاد کے معنی ہیں انحراف۔ بات سے اصل معنی لینے کے بجائے اس کو کسی اور طرف پھیر دینا (قال ابن عباس: الالحاد وضع الکلام علی غیر مواضعہ، ابن کثیر)

پیغمبر اپنی بات کی صداقت ثابت کرنے کے لئے زمین و آسمان کی نشانیاں پیش کرتا تو منکرین کہتے: یہ نشانیاں تو فلاں فلاں دوسرے اسباب کے تحت ظاہر ہورہی ہیں، اس کا تمھارے پیغام کی صداقت سے کیا تعلق۔ ایک واقعہ جس سے حق کی تصدیق نکل رہی تھی، اس کو کسی اور طرف پھیر کر اپنے آپ کو حق سے محروم کرلیتے۔

جب بھی کوئی سچی دعوت اٹھتی ہے، اللہ اس کی تائید کے لئے اس کے گردوپیش مختلف نشانیاں ظاہر کرتا ہے۔ مگر غافل اور سرکش انسان طرح طرح کی توجیہات کرکے اپنے کو مطمئن کرلیتا ہے۔ جس واقعہ سے ایمان کی غذا لینا چاہئے اس سے وہ "الحاد" کی خوراک حاصل کرتا ہے۔

کیسی عجیب ہے وہ محرومی جو کامیابی کے چراغ جلاکر حاصل کی جارہی ہو۔

کتنی مہنگی ہے
ترقی کی یہ قیمت

ناخوش گوار باتیں کرنا کچھ اچھا نہیں۔ ہم کو اس سے زیادہ مصیبتیں گھیرے ہوئے ہیں کہ ہم اس کے ذکر سے اس میں مزید اضافہ کریں۔ مگر وقت کے کچھ نہایت ذہین مفکرین کا خیال ہے کہ ایک برباد مستقبل کے سوا دنیا کا کوئی انجام نہیں۔

زمین پر مشینی تہذیب کی عمر بمشکل چار سو سال ہے۔ اگر واقعات کا سفر بدستور جاری رہے اور کوئی غیر متوقع حادثہ پیش نہ آئے تو ہماری تہذیب ممکن طور پر مزید ایک ملین سال تک زندہ رہے گی۔ مگر ہر قسم کے مصائب، جن میں سے اکثر خود انسان کے پیدا کردہ ہیں، ہر ساعت بڑھتے جا رہے ہیں۔ بڑی طاقتوں کے حربی ذخیرے کبھی اتنے خوفناک نہیں تھے جتنے کہ آج ہیں۔ آبادی کا اضافہ، اندھا دھند تحضر (URBANISATION) ہر چیز کو ٹکنکل بنانے کا لغو شوق، فضا میں مضر گیسوں کا بڑھتا ہوا تناسب، یہ سب تباہی کی اس فہرست کے صرف چند اجزا ہیں جو کسی بھی دن کرۂ ارض کو فنا کر سکتے ہیں۔

ایک نئی مصیبت جس نے اس صورت حال کو اور بھی زیادہ خراب کیا ہے، ریڈیائی لہریں ہیں جو خاص طور پر شہری علاقوں پر چھاتی جا رہی ہیں — ریڈیو، ٹیلی وژن، راڈر، سٹلائٹ، مواصلاتی نظام، لیزر، الٹراوائلٹ لیمپ۔ ہائی ٹنشن والے بجلی کے تار، وغیرہ ان چیزوں سے جو برقی اور ریڈیائی لہریں نکلتی ہیں، ان کے اثرات غیر محسوس ہوتے ہیں مگر ان کا مسلسل اجتماع خاموش طور پر نسیجوں (TISSUES) کو ختم یا برباد کر دیتا ہے۔ ریڈیائی لہروں سے جسمانی نظاموں پر جو برے اثرات پڑتے ہیں، ان کا ابھی تک اندازہ نہیں کیا گیا ہے۔ کیا یہی چیزیں ہیں جو جدید دنیا میں بعض خاص قسم کی بڑھتی ہوئی بیماریوں کا سبب ہیں۔ یہ مضحکہ خیز حد تک مہنگی قیمت ہے جو آج کا مشینی انسان نام نہاد ترقی کے لئے ادا کر رہا ہے۔ ہمارا خاتمہ شاید اس قسم کا شاندار خاتمہ نہیں ہوگا جیسا ستاروں کے ٹکراؤ سے ہوتا ہے۔ یہ زندگی کا بس ایک خاتمہ ہوگا، خاموش خاتمہ۔

Without A Whimper

It isn't pleasant to be doomsayer—enough misery surrounds us without having to add to it by exercising the imagination—but some of the astutest thinkers of the day see nothing but a bleak future for the world. If all goes well, more or less, the technological civilisation on the earth, barely 400 years old, may expect to survive intact for possibly a million years. But perils of all kinds, most of them man-made, keep sprouting by the hour. The arsenals of the major powers have never been as deadly as today, the growth of population, with a marginal, perhaps "seasonal" fall, and the stresses consequent on mindless urbanisation and an absurdly runaway technological system; the continuing pollution of the biosphere with toxic chemicals and even more insidious carbon dioxide; the ever-mounting number of non-biodegradable synthetics and polymers—this is a short list of the catastrophes that may befall the planet any day. To make things even worse, a new peril has come on the scene: the intolerable levels of microwave radiation which blanket urban areas. The sources include radio and TV antennae, radar; microwave ovens, satellite communications system terminals, lasers, ultraviolet lamps and high-tension overhead electric cables. The effect is silent but cumulative and kills or destroys tissue without warning. High-frequency radiation, whether the intensity be low or high, has as yet unassessed effects on all biosystems. Would it be sheer pessimism to link this with the high rate of certain diseases in the United States? It doesn't seem so. So then this is the ridiculously high price technological man is being called upon to pay for his so-called progress. Perhaps the end won't be spectacular as in an interestellar collision; it will be a calm extinction of life, with not a whimper heard from any living thing.

The Times of India
April 22, 1978
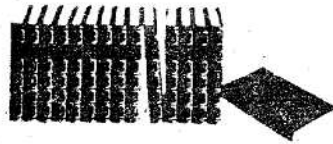
۱۔ ایک منزل کئی قافلے   از یعقوب سروش

صفحات ۱۶۰   قیمت دو روپے پچاس پیسے

پتہ : مکتبہ دوام ، ٹانڈہ ، فیض آباد

یہ کتاب مصنف کے سفر حج کے نقوش، مشاہدات اور تاثرات پر مشتمل ہے۔ مصنف لکھتے ہیں "میں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ طرز تحریر میں شگفتگی پیدا کروں تاکہ پڑھنے والے اکتا نہ جائیں۔ اسی لئے میں نے افسانوی اسلوب کو اپنایا ہے۔ اور اسی تکنک میں کتاب کی ابتدا کی ہے اور اختتام بھی۔"

"افسانوی اسلوب" کے بارے میں تبصرہ نگار کا نقطۂ نظر الرسالہ کے قارئین سے مخفی نہیں۔ تاہم کتاب میں متعدد "تراشے" درج ہیں جن میں مختلف اصحاب قلم نے کھل کر اس اسلوب کی داد دی ہے۔ اخبار صدق جدید لکھنؤ نے لکھا ہے۔ "سروش صاحب نے خود ہی سفر نہیں کیا ہے بلکہ ان کا قلم دوسروں کے دل میں شوق سفر کی آگ بھڑکانے والا ہے۔"

۲۔ آسان عربی زبان   از مولانا شہاب الدین ندوی

قیمت حصہ اول دو روپے   دوم چار روپے

پتہ : فرقانیہ اکیڈمی، ۸۹ داسرہلی، ٹمکور روڈ،
بنگلور نارتھ

مصنف دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ مجھے عربی زبان سیکھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ اس سلسلہ میں ہند و پاک کے مختلف کتب خانوں سے اس موضوع کی کتابیں منگوا کر دو تین سال تک ان میں سر کھپاتا رہا۔ مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر ۱۹۵۶ میں مجھ کو ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لینا پڑا۔ اپنے تجربہ کی روشنی میں یہ خیال ہوا کہ عربی زبان سکھانے والی ایسی کوئی کتاب ضرور ہونی چاہیئے جو عام کاروباری یا ملازمت پیشہ لوگوں کے لئے رہنما بن سکے۔ چنانچہ ۱۹۶۲ میں نئے اور آسان طریقہ پر یہ کتاب لکھ کر تیار کی۔

۳۔ ایجوکیشن آف انڈین مسلمس (انگریزی)

از اختر الواسع

صفحات ۹۸ ، مجلد چالیس روپے

پتہ : پریس ایشیا انٹرنیشنل لمیٹڈ
۲ نظام الدین ویسٹ مارکیٹ ۔ نئی دہلی ۱۳

اس کتاب میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (۱۸۸۶ – ۱۹۴۷) کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اسی تعلیمی تحریک نے ۱۸۷۷ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جس نے ۱۹۲۰ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صورت اختیار کی۔

۴۔ اونلی ون گاڈ (انگریزی)

صفحات ۱۶   قیمت دو روپے پچاس پیسے

پتہ : شاہین بک ایجنسی،
نزد پائدھونی پولیس اسٹیشن۔ بمبئی ۳

یہ انگریزی کتاب بچوں کے لئے ہے۔ اس میں توحید کے عقائد کو سوال و جواب کی صورت میں بتایا گیا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ اسی انداز میں رسالت کے بارے میں ہے۔

۵۔ امت کے لئے لمحہ فکریہ (شادی کی رسموں کے بارہ میں)

از مولانا جمیل احمد نذیری

صفحات ۳۲   قیمت ۷۵ پیسے

پتہ : ہلال بک ڈپو۔ مبارک پور ۔ اعظم گڑھ

سائنسی الحاد اور سوشلسٹ الحاد

مذہب اور لامذہبیت کی کش مکش اگرچہ اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسان کی تاریخ پرانی ہے۔ تاہم پچھلی صدی سے پہلے اس نے کبھی علمی الحاد کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ انیسویں صدی کا فکری انقلاب اور بالآخر ایک طرف ڈارون (۱۸۸۲ — ۱۸۰۹) اور دوسری طرف مارکس (۱۸۸۳ — ۱۸۱۸) کا ظہور انسانی تاریخ کا پہلا واقعہ تھا جب کہ الحاد نے یہ کامیابی حاصل کی کہ وہ علمی منطق اور منظم فلسفہ کے زور پر ایک پوری نسل کے ذہن پر چھا جائے اور مذہب کو دفاع کے مقام پر پناہ لینے کے لئے مجبور کر دے۔

الحاد کی ان دونوں لہروں کو الگ الگ سمجھنے کے لئے ہم ایک کو سائنسی الحاد اور دوسرے کو سوشلسٹ الحاد کہیں گے۔ اولاً سائنسی الحاد کو ابھرنے کا موقع ملا اور اس نے دنیا کے تقریباً تمام حصہ کو کسی نہ کسی طرح متاثر کر ڈالا۔ انیسویں صدی کے آخر تک سائنسی الحاد تعلیم یافتہ دنیا کے ذہنوں پر اس قدر چھا چکا تھا کہ کچھ لوگوں کو یہاں تک کہنے کی جرأت ہوئی کہ "خدا مرچکا ہے" اب، کم از کم علمی طور پر، اس کے دوبارہ زندہ ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

مگر سائنسی الحاد "آزاد دنیا" کا الحاد تھا اور آزادانہ غور و فکر کی فضا میں جس طرح ایک نقطۂ نظر کو غلط قرار دینے کے مواقع ہوتے ہیں اسی طرح یہ امکان بھی رہتا ہے کہ دوبارہ نئے دلائل کے ساتھ اس کو صحیح ثابت کیا جا سکے۔ مذہب کے ساتھ یہی ہوا۔ بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی گزری تھی کہ خود سائنس کی دنیا میں ایسی تحقیقات سامنے آنا شروع ہو گئیں جنھوں نے ان تمام مفروضات کو بالکل منہدم کر دیا جن کے اوپر علمی الحاد کی بنیاد کھڑی کی گئی تھی۔ جولین ہکسلے (۱۸۸۷-۱۹۷۵) کی کتاب انسان تنہا کھڑا ہوتا ہے (Man Stands Alone) کے اگلے ایڈیشن کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ امریکی سائنسداں کریسی مارسین (۱۸۸۴ — ۱۹۴۶) نے اعلان کیا: انسان تنہا نہیں کھڑا ہو سکتا۔ (Man does not Stand Alone)

وائٹ ہیڈ (۱۸۶۱ — ۱۹۴۷) اڈنگٹن (۱۸۸۲ — ۱۹۴۴) اور جیمز جینز (۱۸۷۷ — ۱۹۴۶) نے علمی الحاد کے خلاف جو کروسیڈ شروع کی تھی وہ اب اس نوبت کو پہنچ چکی ہے کہ ساری مغربی دنیا کی نئی نسل میں وہ جوابی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی ہے جس کو غلط طور پر "اینٹی سائنس" کہا جاتا ہے۔ کائنات کی ملحدانہ تعبیر بے دلیل ثابت ہو گئی۔ عقلی ذرائع سے اخلاقیات کا کوئی معیار تلاش کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ سماجی علوم کسی بہتر انسانی سماج کی تشکیل میں ناکام رہے۔ صنعتی تہذیب انسان کو حقیقی خوشی نہ دے سکی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ساری آزاد دنیا میں مذہب کی طرف واپسی کا رجحان پیدا ہو چکا ہے۔ تقریباً ۵۰ سال کے عارضی وقفہ کے بعد دوبارہ وہ مذہبی دور واپس آنا شروع ہو گیا ہے جو اس سے پہلے دنیا میں پایا جاتا تھا۔

مگر سوشلسٹ الحاد کا معاملہ مکمل طور پر مختلف ہے۔ سائنسی الحاد اگر فکری الحاد ہے تو سوشلسٹ الحاد جبری الحاد۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو دلیل سے ختم کرنا انتہائی دشوار ہے۔

پہلی عالمی جنگ نے سوشلسٹ الحاد کو موقع دیا کہ ۱۹۱۷ میں وہ دنیا کے ایک "سرحدی ملک" پر اپنا سیاسی اقتدار قائم کر لے۔ اس کے صرف ۳۰ سال بعد دوسری عالمی جنگ کے حالات نے اس کے رقبہ اور طاقت کو بہت زیادہ بڑھا دیا۔

۱۹۴۸ میں چین کا سرخ انقلاب اس کی تیسری بڑی چھلانگ تھی جس نے اس کو پوری "قدیم دنیا" میں سب سے بڑی طاقت کی حیثیت دے دی۔ اپریل ۱۹۷۸ میں افغانستان میں کمیونسٹ پارٹی کی حکومت قائم ہونا پوری غیر اشتراکی دنیا خاص طور پر مشرقی دنیا کے لئے سرخ انتباہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کمیونزم اپنی نظریاتی طاقت سے قوموں کو مسخر نہ کرسکا۔ اب وہ سازشوں اور ہتھیاروں کے ذریعہ ملکوں کو فتح کرنا چاہتا ہے۔ قدرتی طور پر سرخ منصوبہ کے اس دوسرے مرحلہ کا رخ پس ماندہ مشرق کی طرف ہے جب کہ پہلے مرحلہ میں اشتراکی مفکرین کو نظر آیا تھا کہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کے اوپر سب سے پہلے سرخ انقلاب کا آفتاب طلوع ہوگا۔ مسلم ملکوں (مثلاً ایران، پاکستان) میں باہمی لڑائیوں نے اندرونی طور پر جو سیاسی عدم استحکام پیدا کر رکھا ہے، اس نے جدید کمیونسٹ منصوبہ کے لئے نہایت موافق حالات پیدا کر دیئے ہیں۔ امیر بخارا کی نادانیوں نے موجودہ صدی کے آغاز میں بخارا و سمرقند میں سرخ انقلاب کے لئے راستہ صاف کیا تھا، اب صدی کے اختتام پر اسلام کے نام پر اٹھنے والی تحریکیں دوبارہ نہایت اخلاص کے ساتھ ایسی سرگرمیوں میں مصروف ہیں جو صرف غیر اسلامی قوتوں کے لئے راستہ ہموار کرنے والی ہیں۔ بعض سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ افغانستان کی تاریخ مستقبل قریب میں پڑوس کے مسلم ملکوں میں بھی دہرائی جاسکتی ہے۔ ایک مبصر نے لکھا ہے:

He has correctly analysed the Afghan coup as a significant advance of Soviet interests in Asia. I would go further and predict that within five to ten years (if the regime is not overthrown by the CIA or SAVAK) the Soviet Union will have militarily strengthened Afghanistan to the point at which it will be strong enough to provide military support to guerrila groups in Pakistan and Iran.

The Times of India, May 31, 1978, P.6

"انھوں نے درست طور پر اندازہ کیا ہے کہ افغانستان کا انقلاب ایشیا میں روس کی دل چسپی کی طرف ایک معنی خیز پیش قدمی ہے۔ میں اس سے آگے بڑھ کر یہ پیش گوئی کروں گا کہ اگر امریکہ یا ایران نے موجودہ افغانی حکومت کا تختہ الٹ نہ دیا تو روس پانچ سے دس سال کے اندر افغانستان کو فوجی اعتبار سے اتنا طاقت ور بنا دے گا کہ وہ اس قابل ہو جائے گا کہ ایران اور پاکستان کی گوریلا جماعتوں کی فوجی مدد کرسکے۔"

سوشلسٹ الحاد کے اندر یہ حیرت انگیز صلاحیت ہے کہ اس کا غلبہ صرف سیاسی غلبہ نہیں ہوتا۔ ایک بار غالب آنے کے بعد وہ انسان کے ذہن کو مکمل طور پر اپنے کنٹرول میں لے لیتا ہے۔ اس کی منطق کے مطابق اس کے لئے نہ صرف پیداواری ذرائع کو سرکاری ملکیت میں لینا ضروری ہے بلکہ فکری اداروں کو بھی اپنے قبضہ میں لینے کا اسے پورا حق حاصل ہے۔ اس کی عملداری میں کسی کے لئے ممکن نہیں رہتا کہ سرکاری خطوط کے علاوہ کسی دوسرے ڈھنگ سے سوچ سکے۔ سوشلسٹ الحاد کو اگر جبری الحاد کہا جائے تو اس کے علمی مفہوم کے اعتبار سے بالکل درست ہوگا۔ کوپرنیکس کو جس جبریت فکر کی شکایت تھی وہ سوشلسٹ الحاد کے نظام میں دوبارہ شدید تر شکل میں لوٹ آئی ہے۔ یہاں سرکاری اعلان میں "زمین کی حرکت" مکمل طور پر رک جاتی ہے۔ خواہ اس کے باہر وہ مکمل طور پر گھوم رہی ہو۔

یہ جبری الحاد آج انسانیت کے تقریباً نصف حصہ کو نگل چکا ہے۔ اب وہ بقیہ نصف حصہ کو نگلنے کی طرف

خاموشی سے بڑھ رہا ہے۔ قدیم زمانہ میں یاجوج وماجوج کے خلاف بند تعمیر کرنے کا کام اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین یا سائرس (۵۲۹ - ۶۰۰ ق م) سے لیا تھا جس نے بحیرۂ کیسپین اور بحیرۂ اسود کے درمیان پہاڑی دروں کو بند کرکے اس طوفان کو متمدن دنیا کے شمال میں روک دیا۔ موجودہ زمانہ میں سرخ سیلاب پر روک لگانے کا کام اب تک امریکہ انجام دیتا رہا ہے۔ تاہم یہ "چھتری" اب مشرقی دنیا کے لئے زیادہ قابل اعتماد نہیں رہی ہے۔ کیوبا میں صدر امریکہ مسٹر جان کنیڈی کے صرف ایک الٹی میٹم (۱۹۶۲) نے کمیونسٹ دراندازوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا جب کہ ویٹ نام میں چھ سالہ جنگ (۱۹۶۵ - ۷۱) کے بعد بھی وہ کمیونسٹ سیلاب کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ کی طاقت اٹلانٹک کے مغربی سمت میں جتنی کارآمد ہے، اٹلانٹک کے مشرقی سمت میں نہیں ہے

ان حالات میں فرض کے درجہ میں ضروری ہو چکا ہے کہ اس لاحاصل مشغلہ کو ترک کر دیا جائے جس کو ملی سیاست یا اسلامی سیاست کہا جاتا ہے۔ مسلم اکثریت کے ملکوں میں یہ کام نظام اسلام یا نظام مصطفیٰ کے نام پر حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی تحریکوں کی صورت میں ہو رہا ہے۔ اور اقلیتی ملکوں میں تحفظ حقوق کے نام پر احتجاج ومطالبات کی صورت میں جاری ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ان بے معنی ہنگامہ آرائیوں کا کوئی بھی تعلق اسلام یا مسلمانوں کے مفاد سے نہیں۔ اس قسم کے لوگ اجتماعی زندگی میں اسلام کی جڑیں مضبوط کرنے سے پہلے اسلامی انقلاب کا نعرہ لے کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ جب کہ اجتماعی استحکام سے پہلے اجتماعی انقلاب کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ یہ قرآن کے الفاظ میں، ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا ہے جس کو آدمی نے کیا نہیں (یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا) اس قسم کی نعروں کی سیاست نہ صرف وقت اور قوت کے ضیاع کے ہم معنی ہے۔ بلکہ وہ تخریبی عناصر کو ابھرنے کا موقع دے کر معاملہ کو پہلے سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ بنا دیتی ہے۔

بلاشبہ یہ مطلوب ہے کہ اجتماعی زندگی کے اوپر اسلام کا غلبہ ہو۔ مگر یہ غلبہ خاموش تعمیری عمل سے ہوگا نہ کہ محض سیاسی شور وغل سے۔ اخوانی رہنما شریف کامل نے کہا کہ مصر میں اخوان المسلمین کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ ہم قبل از وقت سیاست میں داخل ہو گئے (تدخلنا فی السیاسة قبل وقتها)۔ مگر بات صرف اتنی نہیں ہے۔ جب بھی کوئی گروہ فیصلہ کن حیثیت حاصل کرنے سے پہلے عملی سیاست میں داخل ہوگا، وہ اپنی کمی کو دوسروں کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ مگر ایسی تدبیروں کا نتیجہ ہمیشہ الٹا نکلتا ہے۔ اخوان المسلمین نے اپنی کمی کو فوجی افسروں کے ذریعہ پورا کرنا چاہا۔ مگر جب انقلاب آیا تو فوجی افسر اخوانیوں کو دھکیل کر خود اقتدار پر قابض ہو گئے۔ پاکستان میں محمد ایوب خاں کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے وہاں کے "اسلام پسند"، شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار بھٹو کے ساتھ مل گئے۔ مگر جب انقلاب آیا تو ملک کے ایک حصہ پر شیخ مجیب الرحمٰن کا اور دوسرے حصہ پر مسٹر بھٹو کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ یہی ڈراما اب ایران میں ہو رہا ہے۔ شاہ ایران کو بے دخل کرنے کیلئے شیعہ علماء (Black Revolutionary) اور کمیونسٹ گروہ (Red Revolutionary) دونوں ایک ہو گئے ہیں۔ اگر بالفرض یہ اتحاد اپنے مقصد میں کامیاب ہو تو انقلاب آنے کے بعد ایران کی حکومت پر جس کا قبضہ ہوگا وہ کمیونسٹ گروہ ہوگا نہ کہ مذہبی علماء۔ اس طرح موجودہ زمانہ کی اسلامی سیاست نے ہر جگہ صرف غیر اسلامی سیاست کو غالب کرنے کا کام انجام دیا ہے۔

حالات کی نزاکت کا تقاضا ہے کہ اس قسم کی لاحاصل سرگرمیوں کو مطلق ترک کر دیا جائے اور اپنی ساری طاقت

تعمیری اور دعوتی کاموں میں لگا دی جائے۔

جہاں تک سائنسی الحاد کا تعلق ہے، اس کے مقابلہ کے لئے ہم کو صرف یہ کرنا ہے کہ سائنسی دریافتوں کے ان پہلوؤں کو جانیں جو دینی معتقدات کی تصدیق کرنے والی ہیں اور ان کو دین کے اثبات و حمایت میں استعمال کریں۔ سائنسی الحاد کو رد کرنے کے لئے سب سے بہتر ہتھیار وہی ہے جو خود سائنس نے موجودہ زمانہ میں فراہم کر دیا ہے۔

مگر اشتراکی الحاد کا معاملہ مکمل طور پر مختلف ہے۔ یہ تاریخ کا واحد نظام ہے جو انسان کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ وہ کلی جبر کی بدترین مثال ہے۔ اس لئے اس کا نظریاتی مقابلہ کرنے کے ساتھ یہ بھی کرنا ہے کہ اس کی عملی گرفت سے بچنے کی ہر ممکن تدبیر کی جائے۔ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی باہمی سیاسی لڑائیاں اشتراکی توسیع کے لئے زرخیز زمین فراہم کرنے کا کام کر رہی ہیں۔ اس کی تازہ مثال افغانستان کا انقلاب ہے۔ یہاں مسلمانوں کا ایک طبقہ مسلمانوں کے دوسرے طبقہ (شاہی خاندان) کا سیاسی مخالف بن گیا۔ اس باہمی اختلاف نے روس کو موقع دیا کہ وہ ایک طبقہ کی حمایت کے نام پر ملک میں گھس آئے۔ اس نے اس طبقہ کا ساتھ دے کر اس کو کامیاب بنایا اور پھر اس کے ذریعہ سے بالواسطہ طور پر ملک کے اوپر قابض ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ترک سیاست موجودہ زمانہ میں احیائے اسلام کی طرف سفر کا پہلا زینہ ہے۔ روایتوں میں بعد کے دور کے جو واقعات بتائے گئے ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو امام مسلم نے ابوہریرہ رضؓ کے واسطے سے نقل کیا ہے:

قال لا تقوم الساعۃ حتیٰ یغزوھا سبعون الفا من بنی اسحٰق فاذا جاؤھا نزلوا فلم یقاتلوا بسلاح ولم یرموا بسھم قالوا لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر فیسقط احد جانبیھا۔ ثم یقولون الثانیۃ لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر فیسقط جانبھا الآخر۔ ثم یقولون الثالثۃ لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر فیفرّج لھم فیدخلوھا فیغنمون (مسلم)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ بنی اسحاق (مسلمانوں) کے ستر ہزار آدمی ایک شہر پر حملہ نہ کریں۔ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو کسی ہتھیار سے جنگ نہیں کریں گے اور نہ کوئی تیر پھینکیں گے۔ وہ صرف لا الہ الا اللہ اللہ اکبر کہیں گے اور شہر کا ایک حصہ گر جائے گا۔ پھر وہ دوسری بار لا الہ الا اللہ اللہ اکبر کہیں گے اور شہر کا دوسرا حصہ گر جائے گا۔ پھر وہ تیسری بار لا الہ الا اللہ اللہ اکبر کہیں گے اور وہ ان کے لئے کھول دیا جائے گا۔ وہ اس کے اندر داخل ہو جائیں گے اور مال غنیمت حاصل کرینگے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی کا مصداق کیا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ تاہم اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسا بھی کوئی دور امت پر آ سکتا ہے جب کہ اس کی فکری اور نظریاتی طاقت ہی قوموں کو زیر کرنے کے لئے کافی ہو۔ سیاسی تصادم اور فوجی مقابلہ کی ضرورت باقی نہ رہے۔ موجودہ حالات اگر حقیقی طور پر اس کا مصداق نہ ہوں، تب بھی اعتباری طور پر یقیناً یہ پیشین گوئی اس پر چسپاں ہوتی ہے۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ نے پچھلے تمام زمانوں سے زیادہ اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ انکار کی طاقت سے قوموں کو مسخر کیا جا سکے۔

قرآن کے سلسلے میں اگر ہم ایسا کر سکیں کہ اس کے مذکورہ بالا دعوے کو اس جانچ کا معیار مان لیں تو یہ معیار حیرت انگیز طور پر یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ خدائی الہام ہے۔ پچھلی ۱۳ سو برس کی تاریخ میں قرآن اور اسلام کے بے شمار دشمن پیدا ہوئے۔ وہ اس چیلنج کے جواب میں قرآن جیسی ایک کتاب عربی زبان میں تیار کر کے نہایت آسانی سے اس کو شکست دے سکتے تھے۔ اور یقیناً بہت سے لوگوں نے اس کی کوششیں بھی کیں۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ مسیلمہ (۶۳۳ -   ) اور ابن مقفع (۷۶۱ - ۷۲۴) سے لے کر صلیبی جنگوں (۱۲۷۱ - 1095) کے بعد پیدا ہونے والے مسیحی مستشرقین تک کوئی بھی اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اب تک کے مطالعہ نے ہمیں جہاں پہنچایا ہے، اس میں اگر ایک اور قرینہ کو ملا لیا جائے تو شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ زیر بحث مسئلہ بڑی حد تک قابل فہم ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ الٰہی قانون نے جو قانونی اصول اب سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے متعین کئے تھے، وہ حیرت انگیز طور پر اب بھی اپنی صحت کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس درمیان میں وضعی قانون نے اس کو رد کر کے جو تبادلی اصول مقرر کئے تھے وہ دو سو سالہ تجربہ میں ناکام ثابت ہو گئے اور اب علم کا دریا دوبارہ اس سمت میں جا رہا ہے جہاں اس نے الٰہی قانون کو چھوڑا تھا۔ وضعی قانون کے مقابلہ میں الٰہی قانون کی یہ ابدیت اسی وقت قابل فہم ہو سکتی ہے جب کہ یہ مانا جائے کہ اس کا سرچشمہ انسانی ذہن کے باہر کسی ابدی ذہن میں پایا جاتا ہے۔

میں یہاں چند مثالیں دوں گا۔

۱۔ الٰہی قانون میں فرد کی آزادی کو خدائی حکم کے پابند کیا گیا ہے:

يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ — کہتے ہیں کیا امر کچھ ہمارے ہاتھ میں بھی ہے۔

قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ (آل عمران - ۱۵۴) — کہہ دو امر سب کا سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے بعد عالمی ذہن میں جو انقلاب آیا، اس نے اس اصول کو غلامی سے تعبیر کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ آزادی سب سے بڑی انسانی قدر ہے۔ فرانس کے انقلاب (۱۷۸۹) سے لے کر اب تک اس اصول کو دو سو برس تجربہ کرنے کا موقع ملا۔ مگر اس تجربہ کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ اب ایسے محققین پیدا ہو رہے ہیں جو فرد کی آزادی کو بے معنی قرار دے رہے ہیں۔ پروفیسر اسکنر (۱۹۰۴ -   ) کا کہنا ہے کہ:

WE CAN'T AFFORD FREEDOM

(ہم آزادی کا تحمل نہیں کر سکتے)۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مفکرین کے برعکس اسکنر (B.F. SKINNER) کا کہنا ہے کہ آزادی کوئی خیر اعلیٰ (SUMMUM BONUM) نہیں۔ انسان کو لا محدود آزادی نہیں بلکہ پابند نظام (DISCIPLINED CULTURE) چاہئے۔ انسانی فکر کی یہ واپسی الٰہی قانون کی ابدیت کا بالواسطہ اعتراف ہے۔

۲۔ الٰہی قانون کی رو سے مرد اور عورت کا دائرہ کار الگ الگ ہے اور عملی زندگی میں مرد کو عورت پر فوقیت دی گئی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ (نساء-۳۴) مرد قوام ہیں عورتوں کے اوپر

وضعی قوانین نے اس اصول کو مکمل طور پر غلط قرار دیا۔ مگر سو برس کے تجربہ نے بتایا کہ الٰہی قانون ہی اس معاملہ میں حقیقت سے قریب تر ہے۔ آزادیٔ نسواں کی تحریک کی تمام تر کامیابیوں کے باوجود آج بھی "مہذب" دنیا میں مرد ہی جنس برتر (DOMINANT SEX) کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزادیٔ نسواں کے علم بردار یہ کہتے تھے کہ عورت اور مرد کا فرق محض سماجی حالات کی پیداوار ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں، مختلف متعلقہ شعبوں میں، اس مسئلہ کا جو گہرا مطالعہ کیا گیا ہے، اس سے ثابت ہوا ہے کہ صنفی فرق کے پیچھے حیاتیاتی عوامل (BIOLOGICAL FACTOR) کارفرما ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر جیروم کاگن (- ۱۹۲۹) کے مطالعہ نے اسے بتایا ہے:

SOME OF THE PSYCHOLOGICAL DIFFERENCES BETWEEN MEN AND WOMEN MAY NOT BE THE PRODUCT OF EXPERIENCE ALONE BUT OF SUBTLE BIOLOGICAL DIFFERENCES. (33)

مرد اور عورتوں میں بعض نفسیاتی فرق محض معاشرتی تجربات کی وجہ سے نہیں ہو سکتے بلکہ وہ لطیف قسم کے حیاتیاتی فرق کی پیداوار ہیں۔

ایک امریکی سرجن (EDGAR BERMAN) کا فیصلہ ہے کہ "عورتیں اپنی ہارمون کیمسٹری کی وجہ سے اقتدار کے منصب کے لئے جذباتی ثابت ہو سکتی ہیں":

BECAUSE OF THEIR HORMONAL CHEMISTRY WOMEN MIGHT BE TOO EMOTIONAL FOR POSITIONS OF POWER.

Time Magazine, March 20,1972,(p.28)

امریکہ میں آزادیٔ نسواں کی تحریک کافی طاقت ور ہے۔ مگر اب اس کے حامی محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کی راہ کی اصل رکاوٹ سماج یا قانون نہیں بلکہ خود فطرت ہے۔ فطری طور پر ہی ایسا ہے کہ عورت بعض حیاتیاتی محدودیت (LIMITATIONS OF BIOLOGY) کا شکار ہے۔ میل ہارمون اور فیمیل ہارمون کا فرق دونوں میں زندگی کے آغاز ہی سے موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ تحریک نسواں کے پرجوش حامی کہنے لگے ہیں کہ فطرت ظالم ہے۔ ہمیں چاہئے کہ پیدائشی سائنس (SCIENCE OF EUGENICS) کے ذریعہ جنیٹک کوڈ کو بدل دیں اور نئے قسم کے مرد اور نئی قسم کی عورتیں پیدا کریں۔ یہ ہے وہ آخری انجام جو امریکی عورت کے نعرہ پالیسی بناؤ کافی نہ بناؤ (MAKE POLICY NOT COFFEE) کا دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک میں ہوا ہے۔

یہ واقعہ اس بات کا ایک تجرباتی قرینہ ہے کہ وضعی قانون کے مقابلہ میں الٰہی قانون میں فطرت کی رعایت زیادہ پائی جاتی ہے۔

۳۔ الٰہی قانون میں سزا کا خاص مقصد نکال (دوسروں کے لئے عبرت) بتایا گیا ہے۔ اسی لئے الٰہی قانون نے بعض بڑے جرائم کی نہایت سخت سزائیں مقرر کی ہیں تاکہ ایک کا انجام دیکھ کر دوسرے اس سے

رک جائیں۔ مگر جدید دور میں اس کو رد کر دیا گیا۔ پہلا نمایاں شخص جس نے مجرمین کی سزا میں تخفیف کی وکالت کی وہ اٹلی کا ماہر جُرمیات کیساری بیکریا (۱۷۹۴ – ۱۷۳۸) تھا۔ اس کے بعد سے اب تک جرمیات (CRIMINALOGY) کے موضوع پر بہت کام ہوا ہے، ماہرین کا عام طور پر یہ خیال ہو گیا تھا کہ جرم کوئی "ارادی واقعہ" نہیں، اس کے اسباب حیاتیاتی ساخت، ذہنی بیماری، معاشی تنگی، سماجی حالات وغیرہ میں ہوتے ہیں۔ اس لئے مجرم کو سزا دینے کے بجائے اس کا "علاج" کرنا چاہیئے۔ حتیٰ کہ تین درجن سے زیادہ ایسے ملک ہیں جنھوں نے موت کی سزا کو اپنے یہاں ختم کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ خاتمہ بھی صرف اخلاقی جرائم کی حد تک ہوا ہے۔ سیاسی اور فوجی جرائم کے سلسلے میں اب بھی ہر ملک ضروری سمجھتا ہے کہ مجرم کو سخت ترین سزا دی جائے۔

مگر جنگ عظیم ثانی کے بعد جرائم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کو روکنے کی تمام معالجاتی تدبیریں ناکام ہو چکی ہیں۔ چنانچہ کئی ملکوں مثلاً ڈیلاویر (DELAWARE) اور سری لنکا میں پہلے سزائے موت ختم کی گئی تھی اور اب اس کو دوبارہ بحال کر دیا گیا ہے۔ ماہرین قانون میں دوبارہ ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ایک بیرسٹر نے کہا ہے "لوگوں میں یہ عام تاثر ہونا کہ کسی بھی شخص کو قتل کرنا، مجرم کو موت کی سزا کا مستحق بناتا ہے، اپنے اندر بہت بڑی مانع قدر (DETERRENT VALUE) رکھتا ہے"

یہ تجربہ اس مفروضہ کی تصدیق کرتا ہے کہ جرم کی سزا کا مسئلہ جن پیچیدہ سوالات سے گہری واقفیت چاہتا ہے، الٰہی قانون میں اس کی رعایت وضعی قانون سے زیادہ پائی جاتی ہے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا، اس کا خلاصہ مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ وضعی قانون کوئی قابل قبول اصول قانون دریافت کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہا ہے۔ مزید یہ کہ وہ آئندہ بھی ناکام ہی رہے گا۔ کیونکہ انسان کی محدودیت یہاں راہ میں حائل ہو رہی ہے۔

۲۔ وہ واقعہ جس نے انسان کے لئے اصول قانون کی دریافت کو ناممکن بنا دیا ہے، اسی میں الٰہی قانون کی صداقت کا قرینہ چھپا ہوا ہے۔ کیونکہ ایک طرف ذہن انسانی کی محدودیت اور دوسری طرف حقائق کی وسعت ظاہر کر رہی ہے کہ کوئی ایسا ذہن ہو جو انسانی ذہن سے برتر ہو اور جس کے اندر سارے حقائق موجود ہوں۔

۳۔ کائنات میں ایسے واقعات ہیں جو فطرت اور جبلّت کی سطح پر الہام کا امکان ثابت کر رہے ہیں۔ الٰہی قانون اس میں صرف یہ اضافہ کرتا ہے کہ اس الہام کو انسان تک وسیع کر دیتا ہے۔ یہ واقعہ اس مفروضہ کو مزید مؤید کرتا ہے کہ موجودہ الٰہی قانون میں کچھ ایسی برتر امتیازی خصوصیات ہیں جو اسی وقت قابل فہم ہو سکتی ہیں جب کہ یہ مانا جائے کہ وہ ایسے ذہن سے نکلا ہے جو انسان کے مقابلہ میں زیادہ وسیع طور پر حقائق کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

چند سوالات

اگر یہ مان لیا جائے کہ الٰہی قانون ہی اصول قانون کی تلاش کا جواب ہے جب بھی چند سوالات باقی رہتے ہیں۔

۱۔ مختلف مذاہب "الٰہی قانون" کا حامل ہونے کے دعوے دار ہیں اور ان میں کافی اختلافات بھی ہیں۔ پھر وہ کون سا معیار ہوگا جس کی بنیاد پر کسی ایک مذہب کے قانون کو الٰہی قانون قرار دیا جائے گا۔

۲۔ کسی ایک مذہب کو معیار ماننے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان کے اندرونی اختلافات کو طے کرنے کی صورت کیا ہوگی۔

۳۔ یہ الٰہی قانون ہزار برس سے بھی زیادہ قدیم زمانہ میں آیا۔ اس دوران میں زندگی میں بے شمار تبدیلیاں ہوگئیں۔ پھر اس کو نئے حالات کے مطابق کس طرح بنایا جائے گا۔

یہ تین بڑے سوالات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں مختصراً عرض کروں گا۔

مذاہب کی کثرت سے یہ بات یقیناً ثابت ہوتی ہے کہ ہر زمانہ میں اور ہر قوم میں خدا کی طرف سے اس کا قانون بھیجا گیا۔ مگر ان کا باہمی اختلاف یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک ہی ہوگا جس کو الٰہی قانون کا صحیح نمائندہ قرار دیا جا سکے۔ تعدد (PLURALISM) عقلی طور پر ناقابل فہم عقیدہ ہے۔ اب یہ سوال ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو مستند نمائندہ کی حیثیت سے منتخب کرنے کی صورت کیا ہو۔ اس کا بالکل سیدھا سادا علمی طریقہ یہ ہے کہ ان کو تاریخ کے معیار پر جانچا جائے اور جس مذہب کا تاریخی طور پر محفوظ اور معلوم ہونا ثابت ہو جائے اس کو لے لیا جائے۔

اگر میں یہ کہوں تو یقیناً میں کسی صاحب علم کی معلومات میں اضافہ نہیں کروں گا کہ تاریخی جانچ کی کسوٹی پر صرف ایک ہی مذہب پورا اترتا ہے اور وہ اسلام ہے۔ آپ کوئی بیاگریفیکل ڈکشنری کھولیں تو تمام پیغمبروں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اکیلے ہوں گے جن کے نام کے آگے عام قاعدہ کے مطابق قوسین میں (۶۳۲ – ۵۷۰) لکھا ہوا ہوگا جس طرح دوسری تاریخی شخصیتوں کے نام کے آگے ہوتا ہے۔ حضرت محمدؐ واحد پیغمبر ہیں جن کی زندگی تاریخ کے تحریری ریکارڈ میں شامل ہے۔ آپ کے متعلق ہر بات معلوم ہے اور آپ کے تبرکات اور مکتوبات تک اصلی حالت میں موجود ہیں۔ حتیٰ کہ معاصر مورخین کے یہاں بھی آپ کا نام ثبت ہوگیا ہے۔ مثال کے طور پر عین آپ کے زمانہ حیات میں ساتویں صدی عیسوی میں آرمینی زبان میں ایک کتاب (CHRONICLE OF SEBEOS) لکھی گئی۔ اس کتاب کا آرمینی متن پٹروگریڈ سے ۱۸۷۹ میں ۱۱۸ صفحات پر شائع ہوا اور اس کے بعد روسی اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے مقالہ نگار پروفیسر مارگولیتھ (D.S. MARGOLIOUTH) (۱۸۵۸ – ۱۹۴۰) نے حضرت محمد کے بارے میں اس کے اندراجات کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے:

> HE WAS AN ISMAELITE WHO TAUGHT HIS COUNTRYMEN TO RETURN TO THE RELIGION OF ABRAHAM AND CLAIM THE PROMISES MADE TO THE DESCENDENTS OF ISMAEL.
>
> (Vol.8, p.872)

(وہ ایک اسمٰعیلی تھے جنھوں نے اپنے اہل ملک کو یہ تعلیم دی کہ وہ ابراہیم کے مذہب کو اپنائیں اور یہ دعویٰ کیا کہ خدا ان

وعدوں کو ان پر پورا کرے گا جو اس نے اسمٰعیل کی اولاد کے ساتھ کئے ہیں۔) یہ صرف حضرت محمد کی خصوصیت ہے کہ جب کوئی محقق آپ پر قلم اٹھاتا ہے تو وہ لکھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کی کامل روشنی میں پیدا ہوئے:

----BORN WITHIN THE FULL LIGHT OF HISTORY (ENCYCLOPEDIA AMERICANA)

اسی طرح وہ قرآن جس کو حضرت محمد نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ یہ میرے پاس خدا کی طرف سے آیا ہے، وہ تمام وکمال محفوظ ہے۔ تمام محققین نے اس کو بطور واقعہ تسلیم کیا ہے۔ یہ صرف قرآن ہی کی خصوصیت ہے کہ اس کے بارے میں جب آپ کسی محقق کو پڑھتے ہیں تو اس کے یہاں لکھا ہوا ملتا ہے:

"THE QURAN APPEARS TO BE THE MOST PART AUTHENTIC"
"THE VERY WORDS THAT HE UTTERED AS A REVELATION AND THAT WERE COLLECTED IN HIS LIFETIME".

Encychlopedia Britanica

یعنی قرآن بالکل مستند شکل میں محفوظ ہے۔ حضرت محمد نے جو الفاظ بطور الہام اپنی زبان سے نکالے تھے۔ قرآن عین انھیں الفاظ پر مشتمل ہے جو آپ کی زندگی ہی میں مرتب کر لیا گیا تھا۔ مقدس کتابوں کی تاریخ میں یہ بات انتہائی عجیب ہے کہ ہرن کی کھال پر لکھا ہوا وہ قرآن آج بھی تاشقند کی لائبریری میں محفوظ ہے جو پیغمبر اسلام کے داماد اور خلیفہ ثالث عثمان غنی (۶۲۴ - ۶۵۶) کے زیر مطالعہ رہتا تھا۔ قرآن کے ابتدائی نسخہ اور موجودہ متداول نسخوں میں ایک لفظ کا بھی فرق نہیں۔

سر ولیم میور (   ) نے لکھا ہے:

”یہی ایک نکتہ کہ مسلمانوں کے فرقے ہر زمانہ میں قرآن کے ایک ہی نسخے کے پیرو رہے ہیں، قطعی طور پر ثابت کر دیتا ہے کہ جو قرآن آج ہمارے ہاتھوں میں ہے، وہی قرآن ہے جسے عثمان کے حکم سے جمع کیا گیا۔ میرا گمان ہے کہ قرآن کے سوا تمام دنیا میں کوئی کتاب نہیں جس کا متن بارہ صدیوں تک اتنا محفوظ اور آلائش سے پاک رہا ہو۔“

EXCEPT THE QUR'AN, THERE IS NO OTHER BOOK UNDER THE SUN, WHICH FOR THE LAST TWELVE CENTURIES HAS REMAINED WITH SO PURE A TEXT.

Life of Mohammed,
Introduction by Sir W. Muir,
London 1858

میں شاید یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ الٰہی قانون کی بنیادی صداقت کو تسلیم کرنے کے بعد ان میں سے کسی کو اختیار کرنے کا سب سے زیادہ غیر مشتبہ علمی معیار تاریخ ہی ہو سکتا ہے اور وہ بلاشبہ قرآن کے حق میں فراہم ہو گیا ہے۔

اب یہ سوال ہے کہ خود اسلام کے اندرونی اختلافات کو کس طرح طے کیا جائے۔

یہ مسئلہ جو بظاہر بھیانک معلوم ہوتا ہے اس وقت بالکل معمولی نظر آنے لگتا ہے جب ہم اس حقیقت کو سامنے رکھیں کہ انسانی طبائع میں اختلاف کی وجہ سے تعبیرات و تشریحات میں اختلاف ناگزیر ہے۔ یہ زندگی کی ایک حقیقت ہے نہ کہ زندگی کا ایک مسئلہ۔ اس کا نہایت سادہ حل قرآن نے یہ تجویز کیا ہے کہ جب کوئی اختلافی سوال کھڑا ہو تو ہر شخص اس پر طبع آزمائی نہ کرے بلکہ اس کو ان لوگوں کے پاس لے جایا جائے جو علم اور تحقیق کے مالک ہیں:

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ، وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ نساء - ۸۳

اور جب ان کے پاس کوئی خبر پہنچتی ہے، امن کی یا خوف کی تو اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ اگر یہ اس کو رسول تک اور اپنے اصحاب امر تک پہنچاتے تو اس کو وہ لوگ جان لیتے جو تحقیق کرنے والے ہیں۔

یہ اختلاف پیدا ہونے کی شکل میں پہلا قدم ہے۔ لیکن اگر اصحابِ علم کی مجلس بھی کسی ایک رائے پر نہ پہنچ سکے تو آخری تدبیر یہ بتائی گئی کہ رائے شماری کے ذریعہ کسی ایک فیصلہ پر پہنچ کر اس کے مطابق عمل کرو:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (شوریٰ — ۳۸) اور ان کا کام باہم مشورہ سے ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ الٰہی قانون کا اندرونی اختلاف صرف ایک علمی مسئلہ ہے، وہ کوئی عملی مسئلہ نہیں۔ الٰہی قانون میں چونکہ بنیادی اصول طے شدہ ہیں، اس لئے علمی بحثیں اسی کے دائرہ میں ہوں گی۔ ان بحثوں سے نہ صرف یہ کہ کوئی حقیقی خرابی نہیں پیدا ہوتی بلکہ وہ کئی پہلوؤں سے فکری ارتقاء میں مددگار ہیں۔ جہاں تک عملی ضرورت کے لئے کسی ایک تعبیر کی تعیین کا سوال ہے، وہ اجتماعی ادارہ یا پارلیمنٹ کے ذریعہ پوری ہو جاتی ہے۔

نئے پیدا شدہ حالات کے سلسلے میں الٰہی قانون کی رہنمائی کس طرح حاصل ہوگی، اس کا جواب اجتہاد ہے۔ اجتہاد کا مطلب سادہ طور پر یہ ہے کہ خدا نے جو بنیادی قانون (قرآن کی صورت میں) دیا ہے اور خدا کے رسول نے اس کی جو لسانی یا عملی تشریح کی ہے، اس کا گہرا علم حاصل کرنا اور اس کو سامنے رکھ کر پیش آمدہ مسائل میں الٰہی قانون کا انطباق تلاش کرنا۔ اس انطباق کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ قرآن وحدیث سے قانونی دفعات اخذ کر کے اس کو ہر زمانہ میں نافذ کیا جاتا رہے۔ بلکہ اس میں خود خارجی دنیا کے غیر متصادم قوانین کو الٰہی قانون کے ڈھانچہ میں قبول کرنا بھی شامل ہے۔ مثال کے طور پر خلیفہ ثانی عمر فاروق کے زمانہ میں عراق، مصر، شام فتح ہوئے تو آپ نے ان ملکوں میں سابقہ رومی، یونانی اور ایرانی قانونِ مال گزاری کو باقی رکھا۔ البتہ جو چیزیں ظلم نظر آئیں، ان میں اصلاح و ترمیم کر دی۔ اسی طرح درآمد و برآمد اور کسٹم کے لئے یہ قانون مقرر کیا کہ بیرونی ممالک میں مسلمان تاجروں کے ساتھ جو معاملہ کیا جاتا ہے وہی معاملہ وہاں کے تاجروں کے ساتھ اسلامی سلطنت میں کیا جائے۔

اجتہاد کا عمل اسلام کی ہزار سالہ تاریخ میں مسلسل جاری رہا ہے۔ مدینہ کی ابتدائی ریاست (۶۳۲ - ۶۲۲) ایک سادہ عرب ریاست تھی جس میں پیغمبر اسلام نے الٰہی قانون کو نافذ کیا۔ اس کے بعد خلافت راشدہ کے زمانہ میں جب اطراف کے متمدن ممالک اسلامی ریاست میں شامل ہوئے تو بہت سے نئے نئے مسائل پیدا ہوگئے۔ اس وقت عمر فاروق (۶۴۴ — ۶۳۶) نے اجتہاد سے کام لے کر نئے حالات کے مطابق الٰہی نظام کو قائم کیا جس کی تفصیل مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴ — ۱۸۵۷) کی کتاب الفاروق میں دیکھی جا سکتی ہے۔ پھر خلافت عباسیہ کے زمانے میں جب اسلامی سلطنت کو مزید وسعت ہوئی اور نظام زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہو گیا تو امام ابو یوسف (۷۹۸ — ۷۸۲) سامنے آئے جو نہ صرف وقت کی سب سے بڑی سلطنت کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تھے بلکہ موجودہ زمانہ کی اصطلاح میں وزارت قانون کا عہدہ بھی انھیں حاصل تھا۔ انھوں نے الٰہی قانون کو نئے وسیع تر حالات سے ہم آہنگ کر دیا جس کا ریکارڈ خود ان کی

لکھی ہوئی "کتاب الخراج"، میں موجود ہے۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں جب دنیا کے حالات میں دوبارہ انقلابی تبدیلیاں ہوئیں تو ترکی سلطان عبدالعزیز عثمانی (۱۸۶۰ - ۱۸۷۶) کے حکم سے ماہرین قانون، فقہا اور عدلیہ کے اعلےٰ عہدہ داروں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے وہ مجموعہ قانون مرتب کیا جو مجلۃ الاحکام الشرعیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مجلہ میں فقہ اسلامی کے اس حصہ کو، جس کو سول لا یا دیوانی قانون کہا جاتا ہے، دفعہ وار قوانین کی شکل میں مرتب کیا گیا ہے۔ یہ قانون ۱۹۱۸ تک خلافت عثمانیہ میں رائج رہا اور مصر، سوڈان، شام، حجاز، عراق اور شرق اردن کی عدالتیں اسی کے بموجب فیصلے کرتی رہیں۔ آج بھی اردن اور سعودی عرب میں یہی قانون کسی قدر ترمیم کے ساتھ رائج ہے۔ مجلۃ الاحکام الشرعیہ ابتداءً عربی اور ترکی زبانوں میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کے ترجمے انگریزی اور دوسری زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

اجتہاد کا یہی طریقہ اختیار کر کے آج بھی الٰہی قانون کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق بنایا جا سکتا ہے اور آئندہ بھی بنایا جاتا رہے گا۔

نوٹ: یہ مقالہ مذہب۔ اخلاق۔ قانون پر ہونے والے بین اقوامی سمینار (نئی دہلی ۱۱ - ۱۶ دسمبر ۱۹۷۳)

INTERNATIONAL SEMINAR ON RELIGION-MORALITY-LAW

کے موقع پر پڑھا گیا۔

ooooooooooooooooooooooooooooooooooooooooo

۔۔۔ مگر ان کے دل مردار سے زیادہ متعفن ہوں گے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لا تقوم الساعۃ حتی یبعث اللہ امراء کذبۃ ووزراء فجرۃ واعوانا خونۃ وعرفاء ظلمۃ وقراء فسقۃ سیماھم سیمی الرھبان وقلوبھم انتن من الجیفۃ اھوائھم مختلفۃ فیتیح اللہ لھم فتنۃ غبراء مظلمۃ فیتھا وکون فیھا۔

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک وہ دور نہ آجائے جس میں جھوٹے حکمراں، بُرے وزراء، بد دیانت ملازمین حکومت، ظالم قائدین ظہور میں نہ آجائیں۔ اس زمانہ میں ایسے فاسق علماء ہوں گے جن کا ظاہر پارسا ؤں جیسا ہوگا اور ان کے دل مردار سے زیادہ متعفن ہوں گے۔ ان کی خواہشات ایک دوسرے سے الگ ہوں گی۔ اس زمانہ میں اللہ ایک ایسا اندھا فتنہ برپا کرےگا جس میں لوگ حیران و سرگرداں ہو کر رہ جائیں گے۔

چند نئی کتابیں

تجدید دین

تجدید کا مطلب ہے خدا کے دین کو انسانی گرد و غبار سے پاک کرنا۔ آج اسلام پر وہ سارے "گرد و غبار" پڑ چکے ہیں جو پچھلی امتوں کے دین پر پڑے تھے۔ یہ گرد و غبار کیا ہے اور خدا کے دین کو کس طرح اس سے پاک صاف کیا جا سکتا ہے، "تجدید دین" میں اس کا مطالعہ کیجئے۔ صفحات ۴۸

مذہب اور جدید چیلنج

"علم جدید کا چیلنج" مولانا وحید الدین خاں کی مشہور کتاب ہے۔ "مذہب اور جدید چیلنج" اسی کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۷ میں اردو میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد عربی اور ترکی زبانوں میں اس کے درجن سے اوپر ایڈیشن شائع ہوئے۔ تمام عالم اسلام میں اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ۱۲ فروری ۱۹۷۶ کو مولانا وحید الدین خاں طرابلس میں صدر قذافی سے ملے تو لیبی لیڈر نے فوراً کہا: لقد قرأت کتابك الاسلام یتحدی (میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدی پڑھ لی ہے)۔
الامام الاکبر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود (جامعہ ازہر قاہرہ) نومبر ۱۹۷۵ میں ہندستان آئے انھوں نے جامعہ ڈابھیل سورت میں تقریر کرتے ہوئے علماء سے کہا کہ آپ لوگ الاسلام یتحدی کا مطالعہ کیجئے۔ جس میں اسلام کے خلاف جدید شبہات کا کافی و شافی رد موجود ہے۔ صفحات ۲۲۶

ان کے علاوہ متعدد دوسری کتابیں تکمیل کے مرحلہ میں ہیں جو انشاء اللہ جلد شائع ہوں گی۔ مثلاً "صفحات" "تاریخ کا سبق"، "ملت کی تعمیر"، "اسلام دور جدید میں"، "سائنسی مضامین"، "مستقبل کی طرف"، وغیرہ

"مذہب اور جدید چیلنج" کا پہلا صفحہ

فروری ۱۹۵۵ کا واقعہ ہے۔ لکھنؤ کے مشہور امین الدولہ پارک میں جماعت اسلامی ہند کے زیر اہتمام ایک عمومی اجتماع ہوا۔ اس موقع پر اسلام کے عقلی اثبات پر مصنف کتاب کی ایک تقریر ہوئی۔ تقریر کے بعد جب اعلان کیا گیا کہ یہ تقریر چھپی ہوئی صورت میں اسٹال پر موجود ہے تو انسانوں کا ہجوم اس کو لینے کے لئے بک اسٹال پر ٹوٹ پڑا اور تقریر کے مطبوعہ نسخے آناً فاناً فروخت ہو گئے۔ بعد میں یہ تقریر "نئے عہد کے دروازے پر" کی صورت میں اردو اور ہندی میں شائع ہوئی۔

یہ پہلا موقع ہے جب کہ مصنف کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جدید الحاد کے جواب میں عصری انداز میں ایک کتاب تیار کرنی چاہئے۔ اس کے لئے مطالعہ اور مواد جمع کرنے کا کام منظم طریقے سے اسی وقت سے شروع ہو گیا۔ مطالعہ کے بعض اجزاء منفرق طور پر بعض ماہناموں میں شائع ہوتے رہے، جب کہ جمع شدہ مواد کی باقاعدہ ترتیب کا کام ۱۹۶۳ میں شروع ہوا اور اگست ۱۹۶۴ میں تحریری طور پر مکمل ہوگیا۔ پہلی بار یہ کتاب ۱۹۶۶ میں ادارۂ تحقیقات و نشریات اسلام (ندوۃ العلماء لکھنؤ) سے شائع ہوئی۔ اس کا عربی ترجمہ ۱۹۷۰ میں کویت کے ناشر دارالبحوث العلمیہ سے الاسلام یتحدیٰ کے نام سے شائع ہوا۔ اب تک اس کے تقریباً ایک درجن ایڈیشن بیروت اور قاہرہ سے شائع ہو چکے ہیں۔ ترکی زبان میں بھی اس کا ترجمہ چھپ چکا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ہے

اردو، عربی، ترکی زبانوں میں اشاعت کے بعد کتاب پر سیکڑوں تبصرے مختلف ملکوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک تبصرہ جزوی طور پر ٹائٹل کے آخری صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے۔ یہ تبصرہ معروف مصری ادیب احمد بہجت کے قلم سے ہے اور وہ قاہرہ کے روزنامہ الاہرام (۲ جولائی ۱۹۷۳) میں شائع ہوا تھا۔ تبصرہ نگار لکھتے ہیں:

"مصنف کتاب نے اسلام کے مطالعہ کا ایک ایسا علمی انداز اختیار کیا ہے جو بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ جدید مادی فکر کے مقابلہ میں دین کو وہ اسی طرز استدلال سے ثابت کرتے ہیں جس سے منکرین مذہب اپنے نظریات کو ثابت کرتے ہیں۔ ۔ ۔ اسلام کے ظہور سے لے کر اب تک چودہ سو سالوں میں اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر تاریخ کو چھانا جائے اور اللہ کی طرف بلانے والی عمدہ کتابوں کو چھلنی سے چھان کر نکالا جائے تو کتاب الاسلام یتحدیٰ بلاشک و شبہ ان میں سے ایک ہوگی۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مصنف کتاب کے عمل کو قبول فرمائے۔ ان کے دل کو نور سے، ان کی عقل کو معرفت سے اور ان کی روح کو رضا سے بھر دے اور ان کے قلم کو ایسی روشنائی عطا کرے جو لکھنے سے کبھی ختم نہ ہو۔"

ناشر

جس زندگی کی ہمیں تلاش ہے

فریڈرش انگلس نے کہا ہے ــــــــ "آدمی کو سب سے پہلے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی چاہیے، اس کے بعد ہی وہ فلسفہ و سیاست کے مسائل پر غور کرسکتا ہے۔" مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے جس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے وہ یہ سوال ہے کہ "میں کیا ہوں؟ ــ یہ کائنات کیا ہے، میری زندگی کیسے شروع ہوئی اور کہاں جاکر ختم ہوگی ــ؟؟؟" یہ انسانی فطرت کے بنیادی سوالات ہیں۔ آدمی ایک ایسی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے جہاں سب کچھ ہے مگر یہی ایک چیز نہیں۔ سورج اس کو روشنی اور حرارت پہنچاتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے اور کیوں انسان کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ ہوا اس کو زندگی بخشتی ہے مگر انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کو پکڑ کر پوچھ سکے کہ تم کون ہو اور کیوں ایسا کر رہی ہو؟ وہ اپنے وجود کو دیکھتا ہے اور نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں اور کس لئے اس دنیا میں آگیا ہوں۔ ان سوالات کا جواب متعین کرنے سے انسان کا ذہن قاصر ہے مگر انسان بہرحال ان کو معلوم کرنا چاہتا ہے۔ یہ سوالات خواہ لفظوں کی شکل میں متعین ہو کر ہر شخص کی زبان پر نہ آئیں مگر وہ انسان کی روح کو بے چین رکھتے ہیں اور کبھی کبھی اس شدت سے ابھرتے ہیں کہ آدمی کو پاگل بنا دیتے ہیں۔ انگلس کو دنیا ایک ملحد

انسان کی حیثیت سے جانتی ہے مگر اس کا الحاد اس کے غلط ماحول کا ردِ عمل تھا جو بہت بعد کو اس کی زندگی میں ظاہر ہوا۔ اس کی ابتدائی زندگی مذہبی ماحول میں گذری، جب وہ بڑا ہوا اور نظر میں گہرائی پیدا ہوئی تو رسمی مذہب سے بے اطمینانی پیدا ہو گئی۔ اپنے اس دور کا حال وہ ایک دوست کے نام اپنے خط میں اس طرح لکھتا ہے:-

"میں ہر روز دُعا کرتا ہوں اور تمام دن یہی دُعا کرتا رہتا ہوں کہ مجھ پر حقیقت آشکارا ہو جائے۔ جب سے میرے دِل میں شکوک پیدا ہوئے ہیں یہی دُعا کرنا میرا مشغلہ ہے میں تمہارے عقیدے کو قبول نہیں کر سکتا۔ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور میرا دل آنسوؤں سے امڈا چلا آ رہا ہے۔ میری آنکھیں رو رہی ہیں لیکن مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں راندۂ درگاہ نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں خدا تک پہنچ جاؤں گا جس کے دیدار کا میں دل و جان سے متمنی ہوں اور مجھے اپنی جان کی قسم! یہ میری جستجو اور عشق کیا ہے یہ رُوح القدس کی جھلک ہے۔ اگر انجیل مقدس دس ہزار مرتبہ بھی اس کی تردید کرے تو میں نہیں مان سکتا۔"

یہ وہی حقیقت کی تلاش کا فطری جذبہ ہے جو نوجوان انگلس میں اُبھرا تھا۔ مگر اس کو تسکین نہ مل سکی اور مروجہ مسیحی مذہب سے غیر مطمئن ہو کر وہ معاشی اور سیاسی فلسفوں میں گم ہو گیا۔

اس طلب کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک خالق اور مالک کا شعور پیدائشی طور پر پیوست ہے۔ وہ اس کے لاشعور کا ایک لازمی جزو ہے۔ "خدا میرا خالق ہے اور میں اس کا بندہ ہوں" یہ ایک خاموش عہد ہے جو ہر شخص اوّل روز سے اپنے ساتھ لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ ایک پیدا کرنے والے آقا و محسن کا تصور غیر محسوس طور پر اس کی رگوں میں دوڑتا رہتا ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنے اندر عظیم خلا محسوس کرتا ہے۔ اس کی رُوح اندر سے زور کرتی ہے کہ جس آقا کو اس نے نہیں دیکھا اسے پالے۔ اس سے لپٹ جائے اور اپنا سب کچھ اس کے

حوالے کر دے۔

خدا کی معرفت ملنا گویا اس جذبے کے صحیح مرجع کو پالینا ہے اور جو لوگ خدا کو نہیں پاتے ان کے جذبات کسی دوسری مصنوعی چیز کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص اپنے اندر یہ خواہش رکھنے پر مجبور ہے کہ کوئی ہو جس کے آگے وہ اپنے بہترین جذبات کو نذر کر دے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان کی سرکاری عمارتوں سے یونین جیک اتار کر ملک کا قومی جھنڈا لہرایا گیا تو یہ منظر دیکھ کر ان قوم پرستوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے جو اپنے ملک کو آزاد دیکھنے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ یہ آنسو در اصل آزادی کی دیوی کے ساتھ ان کے تعلق کا اظہار تھا۔ یہ اپنے معبود کو پالینے کی خوشی تھی جس کے لئے انہوں نے اپنی عمر کا بہترین حصّہ صرف کر دیا تھا۔ اسی طرح ایک لیڈر جب "قوم کے باپ" کی قبر پر جا کر پھول چڑھاتا ہے اور اس کے آگے سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے تو وہ ٹھیک اسی عمل کو دہراتا ہے جو ایک مذہبی آدمی اپنے معبود کے لئے رکوع اور سجدے کے نام سے کرتا ہے۔ ایک کمیونسٹ جب لینن کے مجسمے کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنی ہیٹ اتارتا ہے اور اس کے قدموں کی رفتار سست پڑ جاتی ہے تو اس وقت وہ اپنے معبود کی خدمت میں اپنے عقیدت کے جذبات نذر کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر شخص مجبور ہے کہ کسی نہ کسی چیز کو اپنا معبود بناتے اور اپنے جذبات کی قربانی اس کے آگے پیش کرے۔ مگر خدا کے سوا جن جن صورتوں میں آدمی اپنا یہ نذرانہ پیش کرتا ہے وہ سب شرک کی صورتیں ہیں۔ اور ان الشرك لظلم عظيم (شرک سب سے بڑا ظلم ہے) ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی اصل جگہ کے بجائے دوسری جگہ رکھ دینا۔ مثلاً ڈبہ کے ڈھکن سے آپ بچے کی ٹوپی کا کام لینا چاہیں تو یہ ظلم ہوگا۔ گویا آدمی جب اپنے نفسیاتی خلا کو پر کرنے کے لئے خدا کو چھوڑ کر کسی اور طرف لپکتا ہے، جب وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنی زندگی کا سہارا بناتا ہے تو وہ اپنے اصل مقام کو چھوڑ دیتا ہے، وہ ایک صحیح جذبے کا غلط استعمال کرتا ہے۔

یہ جذبہ چونکہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اس لئے ابتداءً وہ ہمیشہ فطری شکل میں ابھرتا ہے اس کا پہلا رُخ اپنے اصلی معبود کی طرف ہوتا ہے مگر حالات اور ماحول کی خرابیاں اس کو غلط سمت میں موڑ دیتی ہیں اور کچھ دنوں کے بعد جب آدمی ایک مخصوص زندگی سے مانوس ہو جاتا ہے، تو اس میں اس کو لذت ملنے لگتی ہے۔ برٹرینڈ رسل اپنے بچپن میں ایک کٹر مذہبی آدمی تھا۔ وہ باقاعدہ عبادت کرتا تھا۔ اسی زمانے میں ایک روز اس کے دادا جان نے پوچھا "تمہاری پسندیدہ دُعا کون سی ہے؟" چھوٹے رسل نے جواب دیا "میں زندگی سے تنگ آگیا ہوں اور اپنے گناہوں کے بوجھ سے دبا ہوا ہوں"۔ اس زمانے میں خدا برٹرینڈ رسل کا معبود تھا لیکن جب رسل تیرہ برس کی عمر کو پہنچا تو اس کی عبادت چھوٹ گئی اور مذہبی روایات اور پرانی قدروں سے باغیانہ ماحول کے اندر رہنے کی وجہ سے خود اس کے اندر بھی ان چیزوں سے بغاوت کے رجحانات ابھرنے لگے۔ اور بالآخر برٹرینڈ رسل ایک ملحد انسان بن گیا۔ جس کی محبوب ترین چیزیں ریاضی اور فلسفہ تھے۔ ۱۹۵۹ء کا واقعہ ہے۔ بی بی سی لندن پر ایک بات چیت پروگرام میں فری مین نے رسل سے پوچھا "کیا آپ نے مجموعی طور پر ریاضی اور فلسفے کے شوق کو مذہبی جذبات کا نعم البدل پایا ہے"۔ رسل نے جواب دیا "جی ہاں، یقیناً میں چالیس برس کی عمر تک اس اطمینان سے ہم کنار ہو گیا تھا جس کے متعلق افلاطون نے کہا ہے کہ آپ ریاضی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ابدی دُنیا تھی۔ وقت کی قید سے آزاد دُنیا۔ مجھے یہاں مذہب سے ملتا جلتا ایک سکون نصیب ہو گیا"۔

برطانیہ کے اس عظیم مفکر نے خدا کو اپنا معبود بنانے سے انکار کر دیا مگر معبود کی ضرورت سے پھر بھی وہ بے نیاز نہ رہ سکا اور جس مقام پر پہلے اس نے خدا کو بٹھا رکھا تھا۔ وہاں ریاضی اور فلسفے کو بٹھانا پڑا — یہی نہیں بلکہ ریاضی اور فلسفے کے لئے وہ صفات بھی تسلیم کرنی پڑیں جو صرف خدا ہی کی صفت ہو سکتی ہے — ابدیت اور وقت کی قید سے آزادی! کیونکہ اس کے بغیر اسے مذہب سے ملتا جلتا وہ سکون نہیں مل سکتا تھا جو دراصل اس کی فطرت تلاش کر رہی تھی

ایسے لوگ جو خدا کو نہیں مانتے اور پرستش کو بے معنی چیز سمجھتے ہیں وہ اپنے خود ساختہ بتوں کے آگے جھک کر اپنے اندرونی جذبۂ عبودیت کو تسکین دیتے ہیں ۔ یہ حقیقت ہے کہ "الٰہ" انسان کی ایک فطری ضرورت ہے اور یہی اس کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقی ہے ۔ انسان اگر خدا کے سامنے نہ جھکے تو اس کو دوسرے الٰہوں کے سامنے جھکنا پڑے گا کیونکہ الٰہ کے بغیر اس کی فطرت اپنے خلاء کو پُر نہیں کر سکتی ۔

مگر بات صرف اتنی نہیں ہے ۔ اس سے آگے بڑھ کر میں کہتا ہوں کہ جو لوگ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا معبود بناتے ہیں وہ ٹھیک اسی طرح حقیقی سکون سے محروم رہتے ہیں جیسے کوئی بے بچہ ماں پلاسٹک کی گڑیا خرید کر بغل میں دبالے اور اس سے تسکین حاصل کرنا چاہے ایک ملحد انسان خواہ وہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو ۔ اس کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب وہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے سوا کچھ اور ہے جو میں نے پائی ہے ۔

آزادی سے بارہ سال پہلے ۱۹۳۵ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو نے جیل خانے میں اپنی آپ بیتی مکمل کی تو اس کے آخر میں انہوں نے لکھا :

"میں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی کا ایک باب ختم ہو گیا اور اب اس کا دوسرا باب شروع ہوگا ۔ اس میں کیا ہوگا ، اس کے متعلق میں کوئی قیاس نہیں کر سکتا ۔ کتابِ زندگی کے اگلے ورق سربمہر ہیں ۔"

P. 597

Nehru, an Autobiography London (1953)

نہرو کی زندگی کے اگلے اوراق کھلے تو معلوم ہوا کہ وہ دنیا کے تیسرے سب سے بڑے ملک کے وزیر اعظم ہیں اور دنیا کی آبادی کے چھٹے حصہ پر بلا شرکت حکومت کر رہے ہیں ، مگر اس یافت نے نہرو کو مطمئن نہیں کیا اور اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی وہ محسوس کرتے رہے کہ کتاب زندگی کے مزید کچھ اوراق ہیں جو ابھی تک بند ہیں اور وہی سوال آخر عمر میں بھی ان کے ذہن میں گھومتا رہا جس کو لے کر ہر انسان پہلے روز پیدا ہوتا ہے ۔ جنوری ۱۹۶۴ء کے

پہلے ہفتہ میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس نئی دہلی میں ہوئی جس میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے بارہ سو ڈیلیگیٹ شریک ہوئے۔ پنڈت نہرو نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میں ایک سیاستداں ہوں اور مجھے سوچنے کے لئے وقت کم ملتا ہے پھر بھی بعض اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ آخر یہ دنیا کیا ہے، کس لئے ہے، ہم کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ کچھ طاقتیں ہیں جو ہماری تقدیر کو بناتی ہیں۔"

National Herald, January, 1964

یہ ایک عدم اطمینان ہے جو ان تمام لوگوں کے ذہنوں پر گہرے کہر کی طرح چھایا رہتا ہے جنہوں نے خدا کو اپنا الٰہ اور معبود بنانے سے انکار کیا۔ دنیا کی مصروفیتوں اور وقتی دلچسپیوں میں عارضی طور پر کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اطمینان سے ہم کنار ہیں مگر جہاں یہ مصنوعی ماحول ختم ہوا، حقیقت اندر سے زور کرنا شروع کر دیتی ہے اور انہیں یاد دلاتی ہے کہ وہ سچے اطمینان سے محروم ہیں۔

۲۔ میک گل یونیورسٹی کے پروفیسر مائیکل بریچر Michael Brecher نے پنڈت جواہر لال نہرو کی سیاسی سوانح حیات لکھی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے پنڈت نہرو سے ملاقات بھی کی تھی۔ نئی دہلی کی ایک ملاقات میں ۱۳ جون ۱۹۵۶ء کو انہوں نے پنڈت نہرو سے سوال کیا:

"آپ مختصر طور پر مجھے بتائیں کہ آپ کے نزدیک اچھے سماج کے لئے کیا چیزیں ضروری ہیں اور آپ کا بنیادی فلسفۂ زندگی کیا ہے۔"

ہندوستان کے سابق وزیر اعظم نے جواب دیا:

"میں کچھ معیاروں کا قائل ہوں، آپ ان کو اخلاقی معیار Moral Standards کہہ لیجئے۔ یہ معیار ہر فرد اور سماجی گروہ کے لئے ضروری ہیں

اگر وہ باقی نہ رہیں تو تمام مادی ترقی کے باوجود آپ کسی مفید نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے ان معیاروں کو کیسے قائم رکھا جائے، یہ مجھے نہیں معلوم۔ ایک تو مذہبی نقطۂ نظر ہے لیکن یہ اپنے تمام رسوم اور طریقوں کے ساتھ مجھے تنگ نظر آتا ہے۔......
میں اخلاقی اور روحانی قدروں کو مذہب سے الگ کرکے بہت اہمیت دیتا ہوں، لیکن میں نہیں جانتا کہ ان کو ماڈرن زندگی میں کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک مسئلہ ہے۔"

Nehru : A Political Biography (London 1959) 607-8

یہ سوال و جواب جدید انسان کے اس دوسرے خلا کو بتاتا ہے جس میں آج وہ شدت سے گرفتار ہے۔ افراد کو دیانت و اخلاق کے ایک خاص معیار پر باقی رکھنا ہر سماجی گروہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اس کے بغیر تمدن کا نظام صحیح طور پر برقرار نہیں رہ سکتا مگر خدا کو چھوڑنے کے بعد انسان کو نہیں معلوم کہ وہ اس ضرورت کو کیسے پورا کرے۔ سینکڑوں سال کے تجربے کے بعد وہ ابھی بدستور تلاش کی منزل میں ہے۔ پبلک اور حکام کے درمیان عمدہ تعلقات پیدا کرنے کے لئے خوش اخلاقی کا ہفتہ Courtesy week منایا جاتا ہے مگر اس کے بعد بھی جب سرکاری ملازموں کی افسرانہ ذہنیت ختم نہیں ہوتی تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقصد اس طرح حاصل نہیں ہوتا کہ ہم ڈکشنری سے "اخلاق" کا لفظ نکال کر لوگوں کے سامنے رکھ دیں بے ٹکٹ مسافروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو روکنے کے لئے تمام اسٹیشنوں پر بڑے بڑے پوسٹر لگائے جاتے ہیں ـــ "بے ٹکٹ سفر کرنا سماجی گناہ ہے۔"

Ticketless Travel is a Social evil.

مگر جب اس کے باوجود بے ٹکٹ سفر ختم نہیں ہوتا تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ "سماجی گناہ" کا حوالہ وہ احساس پیدا نہیں کر سکتا جو نظم و ضبط کی تعمیل کے لئے محرک بن سکے۔ پریس کے ذریعہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ جرم کا انجام اچھا نہیں ہوتا، مگر جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار

CRIME DOES NOT PAY

بتاتی ہے کہ دنیوی نقصان کے اندیشہ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ آدمی کو جرم سے باز رکھے
تمام دفتروں کی دیواریں مختلف زبانوں کے ان الفاظ سے رنگین کر دی جاتی ہیں —"رشوت
لینا اور رشوت دینا پاپ ہے" مگر جب ایک شخص دیکھتا ہے کہ ہر محکمے میں عین انہیں الفاظ
کے نیچے رشوت کا کاروبار پورے زور و شور سے جاری ہے تو وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتا ہے
کہ اس قسم کے سرکاری پروپیگنڈے رشوت کو روکنے میں کسی درجہ میں بھی مفید نہیں ہیں۔ ریل
کے تمام ڈبوں میں اس مضمون کے کتبے لگائے جاتے ہیں کہ — "ریلوے قوم کی ملکیت ہے
اس کا نقصان پوری قوم کا نقصان ہے" مگر اس کے باوجود جب لوگ کھڑکیوں کے شیشے توڑ
ڈالتے ہیں اور بجلی کے بلب غائب کر دیتے ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ "قوم" کے
مفاد میں اتنا زور نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ایک شخص اپنے ذاتی مفاد کو قربان کر دے —
"اجتماعی ذرائع کو ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرنا ملک و قوم سے غداری ہے" ایک طرف لیڈروں
اور حکمرانوں کی زبان سے یہ اعلان ہو رہا ہے۔ دوسری طرف بڑے بڑے قومی منصوبے اس
لئے ناکام ہو رہے ہیں کہ سرمایہ کا بڑا حصہ اصل منصوبہ پر لگنے کے بجائے متعلقہ کارکنوں کی
تحویل میں چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ساری قومی زندگی انتہائی کوشش کے باوجود ان معیاروں
سے محروم ہو گئی ہے جو قومی تعمیر کے لئے ضروری ہیں اور ان معیاروں کو پیدا کرنے کے لئے
جتنے ذرائع استعمال کئے گئے وہ سب کے سب قطعی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

یہ علامتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ بے خدا تہذیب نے انسانیت کی گاڑی کو دلدل
میں لا کر ڈال دیا ہے اس کو اس پٹری سے محروم کر دیا ہے جس کے اوپر چل کر وہ اپنا سفر بحسن و خوبی طے
کر سکتی ہے۔ زندگی کی کشتی بے لنگر اور بغیر بادبان ہو گئی ہے اس کا واحد حل یہ ہے کہ انسان
خدا کی طرف پلٹے۔ وہ زندگی کے لئے مذہب کی اہمیت کو تسلیم کرے۔ یہی وہ تنہا بنیاد ہے
جس پر زندگی کی بہتر تعمیر ممکن ہے اس کے سوا کسی بھی دوسری بنیاد پر زندگی کی تعمیر نہیں کی
جا سکتی۔